فہرست

شذرات	تقلید اور اجتہاد	منظور الحسن	۲
	ایک ضروری وضاحت	״ ״	۴
قرآنیات	آل عمران (۳: ۱۴۔۱۷)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی	گرما اور سرما میں ظہر کی نماز کے اوقات	زاویۂ فراہی	۹
	اہل کفر کے بچوں کا انجام	طالب محسن	۱۱
دین و دانش	قانون عبادات (۹)	جاوید احمد غامدی	۱۵
حالات و وقائع	تہذیبوں کا تصادم: حیا کے میدان میں	ریحان احمد یوسفی	۲۱
	امام محمد بن اسماعیل بخاری	محمد رفیع مفتی	۳۸
تبصرۂ کتب	''عروج و زوال کا قانون اور پاکستان''	منظور الحسن	۴۳
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۵۳

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

منظور الحسن

تقلید اور اجتہاد

موجودہ زمانے میں مسلمان علما کی غالب اکثریت تقلید جامد کو بطور اصول اختیار کیے ہوئے ہے۔ان کا اصرار ہے کہ احکام دینیہ کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے قدیم علما کا کام ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ان کے کام کی تفہیم اور شرح و وضاحت تو ہو سکتی ہے، مگر اس پر نظر ثانی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ دور اول کے فقہا نے جو اصول و قوانین مرتب کیے ہیں، وہ تغیرات زمانہ کے باوجود قابل عمل ہیں۔اس ضمن میں تحقیق و اجتہاد کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس بات کا اب کوئی امکان ہے کہ کوئی شخص مجتہد کے منصب جلیلہ پر فائز ہو سکے۔اس نقطۂ نظر اور اس پر اصرار کے باوصف واقعہ یہ ہے کہ یہ اہل علم فکر اسلامی کے بارے میں پیدا ہونے والے متعدد شکوک وشبہات رفع کرنے اور نفاذ شریعت کے حوالے سے بعض سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایک طرف ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو ان علما کے زیر اثر تقلید جامد کے اسیر ہیں اور دوسری طرف وہ نسل پروان چڑھ رہی ہے جو رد عمل کے طور پر اسلام کو ایک قصۂ پارینہ قرار دے کر جدید فلاسفہ سے کسب فیض کرنے کے لیے بے تاب ہے۔

ہمارے اہل دانش علما کے اس رویے کو غلط قرار دیتے ہیں۔اس پر تنقید کرتے ہوئے ان کی تقریر بالعموم یہ ہوتی ہے کہ علماے امت صدیوں سے تقلید کے طریقے پر گام زن ہیں۔وہ ماضی بعید کے اہل علم کی تحقیقات اور آرا ہی کو حرف آخر سمجھتے اور قرآن وسنت پر از سر نو غور کرنے کے خلاف ہیں۔مگر موجودہ زمانے میں تمدن کے ارتقا نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں، وہ ان سے صرف نظر کرتے ہوئے قدیم علما ہی کی دینی توضیحات کو اختیار کرنے پر مصر ہیں۔ چنانچہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اجتہاد کے بند دروازے کو کھولا جائے اور اہل علم دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر قرآن وسنت کے احکام کی تعبیر وتشریح کریں۔

اس تصور کے تناظر میں یہ سوالات عام طور پر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ کیا قرآن وسنت کے احکام میں مرور زمانہ کے ساتھ ترمیم وتغیر ہو سکتا ہے، کیا ان معاملات میں بھی اجتہاد ہو سکتا ہے جن میں قرآن وسنت نے نہایت واضح احکام دیے ہیں،

کیا قرآن وسنت کی شرح و وضاحت کے بارے میں ہم علما کی تحقیقات کو اجتہاد ہی سے تعبیر کریں گے؟ ان سوالات کے حوالے سے یہ مناسب ہے کہ یہاں مختصر طور پر اجتہاد کا مفہوم اور اس کا دائرۂ کار بیان کر دیا جائے۔

اجتہاد کا لغوی مفہوم کسی کام کو پوری سعی و جہد کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جس معاملے میں قرآن وسنت خاموش ہیں، اس میں نہایت غور وخوض کر کے دین کے منشا کو پانے کی جدوجہد کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے منسوب روایات کی روشنی میں اجتہاد کا دائرۂ کار حسب ذیل نکات کی صورت میں متعین کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اجتہاد کا تعلق انھی معاملات سے ہے جو کسی نہ کسی پہلو سے دین وشریعت سے متعلق ہیں۔

۲۔ انسانوں کو انفرادی یا اجتماعی حوالے سے جب بھی قانون سازی کی ضرورت پیش آئے تو انھیں چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن وسنت سے رجوع کریں۔

۳۔ جن معاملات میں قرآن وسنت کی رہنمائی موجود ہے، ان میں قرآن وسنت کی پیروی لازم ہے۔

۴۔ جن معاملات میں قرآن وسنت خاموش ہیں، ان میں انسانوں کو چاہیے کہ اپنی عقل وبصیرت کو استعمال کرتے ہوئے آرا قائم کریں۔

ان نکات کی بنا پر یہ بات بطور اصول بیان کی جا سکتی ہے کہ شریعت محل اجتہاد نہیں ہے، بلکہ محل اتباع ہے۔ محل اجتہاد صرف وہی امور ہیں جن کے بارے میں شریعت خاموش ہے۔ چنانچہ اجتہادی قانون سازی کرتے ہوئے، مثال کے طور پر عبادات کے باب میں، یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ تمدن کی تبدیلی کی وجہ سے اب نماز فجر طلوع آفتاب کے بعد پڑھی جائے گی؛ معیشت کے دائرے میں یہ طے نہیں کیا جا سکتا کہ اب زکوٰۃ ڈھائی فی صد سے زیادہ ہو گی؛ سزاؤں کے ضمن میں یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ مثلاً قتل کے بدلے میں قتل کے بجائے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔ گویا شریعت کے دائرے میں علما اور محققین کا کام صرف اور صرف یہی ہے کہ احکام کے مفہوم و مدعا کو اپنے علم و استدلال کے ذریعے سے متعین کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ان کے لیے کسی تغیر وتبدل کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ البتہ، جس دائرے میں شریعت خاموش ہے، اس میں وہ دین ومذہب، تہذیب وتمدن اور عرف ورواج کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر طرح کی قانون سازی کر سکتے ہیں۔

اس باب میں جس طرز عمل کی اصلاح کی ضرورت ہے، وہ مخصوص علماے سابق کی تحقیقات یا اجتہادات پر عمل درآمد کے لیے اصرار ہے۔ اس طرح کی کوئی پابندی اسلام نے عائد نہیں کی۔ اس نے ہر زمانے کے ہر شخص کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ تحقیق واجتہاد کی صلاحیت بہم پہنچانے کے بعد دینی احکام کے حوالے سے اپنی آرا پیش کرے اور ان کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک ضروری وضاحت

ہمارے ممدوح و مخدوم اور مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد رشید علامہ خالد مسعود کی یاد میں سہ ماہی ''تدبر'' کا خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے۔ اس میں ''ایک پرعزم محقق'' کے زیرعنوان ڈاکٹر منصور الحمید صاحب کا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کے بعض مندرجات کے بارے میں جناب خالد مسعود کے داماد نعیم احمد بلوچ صاحب نے مدیر ''اشراق'' جناب جاوید احمد غامدی سے استفسار کیا ہے۔ مدیر ''اشراق'' نے اس کا جو جواب دیا ہے، وہ من و عن حسب ذیل ہے:

۲۰ مارچ ۲۰۰۴ء

محترمی و مکرمی نعیم احمد بلوچ صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ عنایت نامہ ملا۔ آپ نے رسالہ ''تدبر'' میں منصور الحمید صاحب کے مضمون کے بعض مندرجات کے بارے میں پوچھا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس طرح کی چیزوں پر بالعموم کوئی تبصرہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ تاہم ریکارڈ کی درستی کے لیے یہ چند باتیں عرض کر رہا ہوں۔

اولاً، میرے کسی ادارے کے ساتھ ''جماعت اسلامی'' نے کسی نوعیت کا کوئی مالی تعاون کبھی نہیں کیا۔ منصور صاحب نے جس ادارے کا ذکر کیا ہے، وہ میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ایما سے اور ان کی ہدایت کے مطابق ان کے گھر کے پاس ا۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ میں انھی کی دی ہوئی عمارت میں قائم کیا تھا۔ میری عمر اس وقت کم و بیش چوبیس سال تھی۔ اس کے معاملات کو چلانے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ حبیب بنک اچھرہ میں کھولا گیا جس میں مولانا اپنی جیب سے ایک ہزار روپے ماہانہ جمع کراتے تھے۔ اس سے آپ مجھ پر مولانا کے اعتماد اور اس ادارے کے ساتھ مولانا کے تعلق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

ثانیاً، ''ادارہ تدبر قرآن و حدیث'' بھی میری جدوجہد سے قائم ہوا۔ اس کا دستور میرے ہی قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانے میں جناب خالد مسعود صاحب اور ان کے رفقا کا رویہ میرے ساتھ کیا رہا، اس کے متعلق نہ میں نے اس سے پہلے کبھی کچھ کہا ہے اور نہ اب کہوں گا، اس لیے کہ وہ میرے بزرگ تھے اور اس طرح کے معاملات میں میں اس بات کا قائل ہوں کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔

ثالثاً، میں نے اپنے مخاطبین کے لیے ایک خاص سطح ہمیشہ سے طے کر رکھی ہے۔ اس سے نیچے اتر کر کوئی شخص گفتگو کرے تو میں کبھی اس کا جواب نہیں دیتا۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے یہ دعا، البتہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اختلاف کے ساتھ اعتراف کا حوصلہ اور دوسروں کی مذمت کیے بغیر اپنے ممدوحین کو خراج تحسین پیش کرنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

—— جاوید

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ، وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ، وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ، ذٰلِكَ

اُن لوگوں کے لیے (جو اِس بصیرت سے محروم ہیں) دنیا کے مرغوبات: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر[۲۱]، نشان زدہ گھوڑے[۲۲]، چوپائے اور کھیت بہت لبھانے کی چیز بنا دیے گئے ہیں[۲۳]۔ یہ سب دنیا کی

[۲۱] اصل الفاظ ہیں: 'القناطیر المقنطرة'۔ یہ اسی طرح کی ترکیب ہے، جس طرح عربی زبان میں 'الف مولفة' اور 'بدرة مبدرة' وغیرہ کی تراکیب استعمال ہوتی ہیں۔

[۲۲] اس سے مراد ہیں اصیل گھوڑے۔ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ عمدہ اور اصیل گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے۔

[۲۳] اصل میں لفظ 'زین للناس' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس میں مال و اولاد اور زن و فرزند کی محض رغبت پر کوئی تبصرہ نہیں ہے، اس لیے کہ یہ رغبت تو انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، بلکہ ان کی تزیین کا ذکر ہے۔ استاذ امام اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

> ''تزئین' کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح آنکھوں میں کھب جائے کہ آدمی اس کے اثر سے ہر چیز اسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے، یہاں تک کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ، ظاہر ہے، فاطر فطرت کے منشا کے

مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ: لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ، وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ

زندگی کا سروسامان ہے[24] اور اچھا ٹھکانا تو صرف اللہ کے پاس ہے۔ ان سے کہیے کہ میں تمھیں بتاؤں کہ اِن چیزوں سے بہتر کیا ہے؟[25] اللہ سے ڈر کر رہنے والوں کے لیے اُن کے پروردگار کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہیں اور (سب سے

خلاف ہے۔ اسی سے زندگی میں وہ بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جو انسان کو فطرت اور شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک بیماری کی حالت ہے جو بے بصیرتی اور حدود الٰہی کے عدم احترام یا بالفاظ دیگر عدم تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔ نفس اپنی چاہتوں میں فطری حدود سے آگے نکل جاتا ہے، پھر شیطان ان چاہتوں پر ایسا دل فریب ملمع کر دیتا ہے کہ آدمی کی نظر ان سے ہٹ کر کسی اور طرف کا رخ ہی نہیں کرتی۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۰)

اسی طرح مرغوبات نفس کے بیان میں یہاں جو ترتیب ملحوظ ہے، اس کی وضاحت میں انھوں نے لکھا ہے:

''پہلے اہل و عیال کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام انھی کا ہے، دوسری چیزوں کی محبت اصلاً ان کے تابع ہے، بلکہ زیادہ تر انھی کے لیے ہے۔ اس کے بعد مال کا ذکر ہے اور مال میں سونے کا ذکر اس کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے نقود پر مقدم ہے۔ سروسامان میں سب سے پہلے گھوڑوں کا ذکر ہے، اس لیے کہ اہل عرب زینت، فخر اور دفاع، تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد چوپایوں کا ذکر ہے، اس لیے کہ تمدن کے ظہور سے پہلے بدویت کے دور میں معاش کا انحصار بیش تر انھی پر تھا۔ آخر میں کھیتی اور باغ کا ذکر ہے، اس لیے کہ ان کی اہمیت تمدن کے دور میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی ہے جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہایش اختیار کر لی ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۴۱)

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

[۲۴] یعنی اس دنیا کی زندگی کا سروسامان ہے جو خود بھی ناپایدار ہے، جس کی سب چیزیں بھی بالکل بے حقیقت ہیں اور قیامت کے بعد جو خدا کی ابدی بادشاہی قائم ہونے والی ہے، اس کے مقابلے میں جس کی لذتوں پر ریجھنا بھی سراسر حماقت ہے۔ یہ تمام معانی، اگر غور کیجیے تو اس چھوٹے سے فقرے میں بیان ہو گئے ہیں۔

[۲۵] یہ مخاطبین کو زاویۂ نظر بدلنے کی دعوت ہے کہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو اصل زندگی سمجھ کر گزارنے کے بجائے وہ آخرت کی طرف دیکھیں، جہاں ایک ابدی اور لازوال زندگی اور اس کی نعمتیں ان کی منتظر ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا، فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا، وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿١٧﴾

بڑھ کر) اللہ کی خوشنودی ہے[26]، اور (اِس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ) اللہ اپنے اِن بندوں کو دیکھ رہا ہے[27]۔ یہ[28] جو دعائیں کرتے ہیں کہ پروردگار، ہم ایمان لائے ہیں، سو تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔ یہ[29] صبر کرنے والے، سچے، فرماں بردار، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور پچھلی رات کی گھڑیوں میں اٹھ کر اپنے گناہوں کی مغفرت چاہنے والے۔۱۴-۱۷

---

[۲۶] یہ جنت کی نعمتوں کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔ چنانچہ جب اس کا ذکر ہو گیا تو استاذ امام کے الفاظ میں گویا ہر نعمت کا ذکر ہو گیا، اس کا بھی جس کے لیے تعبیر کا کوئی جامہ موجود ہے اور اس کا بھی جو خیال و گمان اور وہم و قیاس، ہر چیز سے بالاتر ہے۔

[۲۷] یہ جملہ تسلی کے محل میں ہے۔ یعنی دیکھ رہا ہے تو ان کے ایمان و عمل اور اس پر ان کی استقامت کا صلہ بھی انھیں لازماً دے گا، ان کی کوئی قربانی بھی اللہ کے حضور میں ضائع نہیں ہو گی۔

[۲۸] یہ پچھلی آیت میں 'لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا' سے بدل ہے۔ مدعا یہ ہے کہ خدا کے ان بندوں کو دیکھو اور تم بھی دنیا کے مرغوبات ہی کے پیچھے بھاگتے رہنے کے بجائے، انھیں چھوڑ کر اس راہ پر آ جاؤ۔

[۲۹] یہ دوسرا بدل ہے جس سے قرآن نے ان اخلاقی اوصاف کو نمایاں کر دیا ہے جو اس کے حاملین میں ہونے چاہییں۔

[۳۰] غربت، بیماری، جنگ اور اس نوعیت کے نرم و گرم حالات میں آدمی عزم و ہمت کے ساتھ اپنے اوپر آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرے اور جس موقف کو وہ صحیح سمجھتا ہے، بغیر کسی مایوسی، گھبراہٹ اور جزع فزع کے اس پر قائم رہے تو یہ صبر ہے۔ قرآن نے یہاں اپنے حاملین کی صفات میں سب سے پہلے اسی کو نمایاں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے، ان کے لیے قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو صبر کا خوگر نہیں بنا سکے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سرما اور گرما میں ظہر کی نماز کے اوقات

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح و وضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روي[1] أنه كان قدر صلاة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الظهر[2] في الصيف ثلاثة أقدام إلى خمسة أقدام و في الشتاء خمسة أقدام إلى سبعة أقدام[3].

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز گرمیوں[1] میں اس وقت پڑھتے تھے جب (آدمی کا) سایہ تین سے پانچ قدم تک ہوتا تھا اور سردیوں میں اس وقت جب سایہ پانچ سے سات قدم تک ہوتا تھا۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ اس روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز گرمیوں میں اول وقت میں اور سردیوں میں موخر کر کے پڑھتے تھے، لیکن دوسری روایتوں سے اس کے برعکس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ گرمیوں میں آپ اسے موخر کر کے

پڑھتے تھے اور سردیوں میں اول وقت میں پڑھتے تھے۔اس تناقض کا سبب بالعموم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدینہ کے علاقے میں سرما اور گرما میں سورج مختلف مقام پر ہوتا ہے۔اس وجہ سے ان موسموں میں سایے کی لمبائی مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ سردیوں کے پانچ سے سات قدم تک سایے کا وقت گرمیوں کے تین سے پانچ قدم تک سایے کے وقت سے مقدم ہوتا ہے۔

متن کے حواشی

۱۔اپنی اصل کے اعتبار سے یہ نسائی کی روایت، رقم ۵۰۳ ہے۔بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

ابوداؤد، رقم ۴۰۰۔نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۱۴۹۲۔بیہقی، رقم ۱۵۸۸۔ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۸۹۔

۲۔'الظھر' کا لفظ ابوداؤد، رقم ۴۰۰ میں روایت نہیں ہوا۔

۳۔ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۸۹ میں یہ بات مختلف طریقے سے بیان ہوئی ہے اور اس کی نسبت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں ہے:

قال عبد اللّٰه : إن أول وقت الظهر أن تنظر إلى قدميك فتقيس ثلاثة أقدام إلى خمسة اقدام وإن أول وقت الآخر خمسة أقدام إلى سبعة أقدام. أظنه قال في الشتاء.

''عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ظہر کا ابتدائی وقت جاننے کے لیے اپنے قدموں کی طرف دیکھو اور سایے کو تین سے پانچ قدم تک ماپ لو۔دوسرے موسم میں (ظہر کا) ابتدائی وقت پانچ سے سات قدم سایے تک ہے۔(راوی کا کہنا ہے کہ) میرے خیال میں یہ (دوسری) بات انھوں نے موسم سرما کے بارے میں بیان فرمائی ہے۔''

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

اہل کفر کے بچوں کا انجام

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۱۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن علی رضي اللّٰه عنه قال: سألت خديجة رضي اللّٰه عنها النبي صلى اللّٰه عليه وسلم عن ولدين ماتا لها في الجاهلية. فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: هما في النار. قال: فلما رأى الكراهية في وجهها قال: لو رأيت مكانهما لأبغضتهما. قالت: يا رسول اللّٰه، فولدي منك؟ قال: في الجنة. ثم قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إن المؤمنين وأولادهم في الجنة. وإن المشركين وأولادهم في النار. ثم قرأ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: والذين آمنوا واتبعتهم ذريتهم بإيمان ألحقنا بهم ذريتهم.

''حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دو بچوں کے بارے میں پوچھا جو زمانۂ جاہلیت میں فوت ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ دونوں جہنم میں ہیں۔ پھر جب آپ نے ان کے چہرے پر ناگواری دیکھی تو فرمایا:

اگر تو ان کا ٹھکانا دیکھتی تو تجھے بھی ان پر غصہ آتا۔ اس پر انھوں نے پوچھا: تو آپ سے میرا بیٹا؟ آپ نے فرمایا: جنت میں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل ایمان اور ان کی اولاد جنت میں ہو گی اور مشرکین اور ان کی اولاد جہنم میں ہو گی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: 'والذین آمنوا واتبعتهم ذريتهم بإيمان ألحقنا بهم ذريتهم'، ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی نسل نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ نے ان کے ساتھ ان کی ذریت کو ملا دیا''۔

لغوی مباحث

الجاهلية: یہ جہل کے مادے سے ایک اسم ہے۔ جو کتب تاریخ و حدیث میں بطور ایک اصطلاح مستعمل ہے۔ اس سے مراد عربوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اس میں جہل علم کے متضاد کے مفہوم میں ہے اور علم سے بھی علم ہدایت مراد ہے۔ دنیوی علوم مراد نہیں ہیں۔ اردو میں جاہلیت کا لفظ اجڈ پن اور ان پڑھ ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اور اس لفظ سے یہی تاثر عربوں کے بارے میں قائم ہو جاتا ہے۔ جبکہ اصل یہ ہے کہ اس سے مقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ زمانہ جب وہ اللہ کی ہدایت سے محروم تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مكان: یہ لفظ جگہ، ٹھکانے اور مرتبے کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں اس سے جہنم میں ان کا ٹھکانا مراد ہے۔ یہ 'كون' سے اسم ظرف بنا ہوا ہے۔

ألحقنا بهم ذريتهم: ہم نے ملا دیا ان کے ساتھ ان کی اولاد کو۔ یہاں ملانے سے جنت میں ایک طبقے یا درجے میں یک جا کر دینا ہے۔

متون

کتب حدیث میں یہ روایت صرف مسند احمد اور دور متاخر کی کتاب ''مجمع الزوائد'' میں آئی ہے۔ یا پھر اس کا ذکر ہمیں کتب رجال مثلاً ''میزان الاعتدال فی نقد الرجال'' اور ''لسان المیزان'' وغیرہ میں ملتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ ان کتب میں کم و بیش یہی ہیں۔ البتہ میزان وغیرہ میں آیت سے استشہاد کا حوالہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک فرق یہ بھی ہے کہ ان میں 'فولدی

منك ' کے بجائے ' فو الدای منك ' کے الفاظ ملتے ہیں۔مزید برآں ان کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کے بیٹے کی ''زوایدمسند'' میں بھی یہ روایت نقل ہوئی ہے۔

معنی

اس روایت کے بھی دو حصے ہیں۔ایک حصہ بطور خاص حضرت خدیجہ کی اولاد سے متعلق ہے۔دوسرے حصے میں عمومی اصول بیان ہوا ہے جو دوسری روایات میں بھی منقول ہے۔مثلاً مشکوٰۃ ہی کی روایت ۱۱۱ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوال کے جواب کے طور پر آپ کی نسبت سے یہی بات بیان ہوئی ہے۔ہم اس پر تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ یہ بات صریحاً قرآن مجید میں بیان کیے گئے مسلمات کے خلاف ہے۔قرآن مجید جنت اور جہنم کو بصراحت دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا پھل قرار دیتا اور ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیے جانے کی نوید سناتا ہے۔مزید برآں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی روایات بھی مروی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معصوم بچوں کو دین فطرت پر بتایا ہے۔اس صورت میں مشرکین کے بچوں کے جہنم میں جانے کی بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔

اس روایت کا پہلا حصہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بچوں سے متعلق ہے۔جہاں تک بچوں کے انجام کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہم نے اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیا ہے، لیکن اس حوالے سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کے پہلی شادیوں سے کتنے بچے تھے اور ان کی عمریں کیا تھیں۔مولانا مودودی مرحوم کی کتاب ' سیرت سرور عالم ' میں یہ معلومات انتہائی اختصار سے بیان ہوگئی ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''پہلے ان کی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی تھی جس سے دولڑکے ہند اور ہالہ پیدا ہوئے اور دوررسالت میں دونوں مسلمان ہوگئے۔ابوہالہ کی وفات کے بعد ان کی شادی عتیق بن عابد المخزومی سے ہوئی جس سے ان کی صاحب زادی ہند پیدا ہوئیں اور عہد نبوت میں وہ بھی مسلمان ہوگئیں۔'' (۱۱۲/۲۔۱۱۳)

یہ کتب انساب اور کتب رجال وتاریخ کا بہت موزوں ملخص ہے۔یہ کتابیں تین ہی بچوں کا ذکر کرتیں اور ان کے عاقل وبالغ اور مسلمان کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہونے کی تصریح کرتی ہیں۔ان میں حضرت خدیجہ کے دو بچوں کے فوت ہونے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔صرف مسند احمد کی روایت ہے جس میں ان دو بچوں کا ذکر ہے جو قبل اسلام فوت ہو گئے تھے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ کتب تاریخ میں یہ روایت نفیاً یا اثباتاً، کسی بھی حوالے سے مذکور نہیں ہے۔اسی طرح اس روایت کی شروح میں بھی بچوں کے ہونے یا نہ ہونے یا ان کی عمروں کے تعین پر کوئی کلام موجود نہیں ہے۔

گمان یہی ہے کہ حضرت عائشہ کے سوال وجواب والی روایت اور حضرت خدیجہ کے سوال وجواب والی یہ روایت، دونوں ناقابل اعتنا ہیں۔یہ راویتیں روایت کے پہلو سے بھی کمزور ہیں اور درایت کے پہلو سے بھی ان میں کوئی جان نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

احمد، رقم ۱۰۷۶۔ مجمع الزوائد، کتاب القدر، باب ماجاء فی الاطفال۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جمعہ کی نماز

جمعہ کے دن مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز ظہر کی جگہ وہ اسی دن کے لیے خاص ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں گے۔ اس نماز کے لیے جو طریقہ شریعت میں مقرر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

یہ نماز دو رکعت پڑھی جائے گی،

نماز ظہر کے برخلاف اس کی دونوں رکعتوں میں قرأت جہری ہوگی،

نماز کے لیے تکبیر کہی جائے گی،

نماز سے پہلے امام حاضرین کی تذکیر و نصیحت کے لیے دو خطبے دے گا۔ یہ خطبے کھڑے ہو کر دیے جائیں گے۔ پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا،

نماز کی اذان اس وقت دی جائے گی، جب امام خطبے کی جگہ پر آ جائے گا،

اذان ہوتے ہی تمام مسلمان مردوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس اگر کوئی عذر نہ ہو تو اپنی مصروفیات چھوڑ کر نماز کے لیے حاضر ہو جائیں،

نماز کا خطاب اور اس کی امامت مسلمانوں کے ارباب حل و عقد کریں گے اور یہ صرف انھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو ان کی طرف سے اس نماز کی جماعت کے لیے مقرر کیے جائیں گے اور جہاں وہ خود یا ان کا کوئی نمائندہ اس کی امامت کے

لیے موجود ہوگا۔

قرآن میں اس نماز کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا، اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ، وَذَرُوا الْبَیْعَ، ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ، وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ، وَاذْکُرُوا اللّٰہَ، کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (الجمعہ ۶۲: ۹۔۱۰)

''ایمان والو، جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ و اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتے رہو تا کہ تمھیں فلاح نصیب ہو۔''

اس نماز کے ائمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی ہے کہ نماز لمبی پڑھائیں اور خطبہ مختصر دیں۔ فرمایا ہے کہ یہ آدمی کے سمجھ دار ہونے کی علامت ہے۔[266]

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی تذکیر و نصیحت اور اجتماعی عبادت کے لیے انبیا علیہم السلام کے دین میں اصلاً یہی دن مقرر کیا گیا تھا۔[267] مؤرخین کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کعب بن لوی یا قصی بن کلاب بھی اس روز قریش کے لوگوں کا اجتماع کیا کرتا تھا۔[268] اس دن کے انتخاب کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ آدم کی تخلیق اسی دن ہوئی، اسی دن وہ باغ میں داخل کیے گئے، اسی دن اس سے نکالے گئے اور قیامت بھی اسی دن برپا ہوگی۔[269] آپ کا ارشاد ہے کہ اس میں ایک ایسی گھڑی بھی آتی ہے جس میں بندۂ مومن اگر اپنے پروردگار سے کسی خیر کا طالب ہو تو اسے وہ دے دیا جاتا ہے۔[270] چنانچہ لوگوں کو آپ نے متنبہ فرمایا ہے کہ وہ اگر جمعہ کے لیے نہیں آئیں گے تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی جائے گی اور وہ غافل ہو کر رہ جائیں گے۔[271] اس کے برخلاف جو لوگ غسل کر کے، پاکیزہ ہو کر اور پوری تزیین کے ساتھ، نماز کے لیے پہنچیں گے، پھر دو آدمیوں کے درمیان میں گھس کر بیٹھنے کی کوشش نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے گا، اس کے لحاظ سے نماز

---

۲۶۶ مسلم، رقم ۸۶۹۔

۲۶۷ مسلم، رقم ۸۵۵۔

۲۶۸ لسان العرب ۲/ ۳۵۹۔

۲۶۹ مسلم، رقم ۸۵۴۔

۲۷۰ بخاری، رقم ۸۹۳۔ مسلم، رقم ۸۵۲۔

۲۷۱ مسلم، رقم ۸۶۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پڑھیں گے اور خاموشی کے ساتھ امام کا خطبہ سنیں گے، انھیں آپ نے بشارت دی ہے کہ ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک جو گناہ انھوں نے کیے ہوں گے، اللہ انھیں معاف کر دے گا۔[272] نیز فرمایا ہے کہ جمعہ کے دن فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور لوگ جس ترتیب سے آتے ہیں، اسی کے لحاظ سے ان کا نام لکھتے ہیں۔ چنانچہ بہت سویرے آنے والوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اونٹ قربانی کے لیے بھیجتا ہے، پھر جو گائے بھیجتا ہے، پھر جو مینڈھا بھیجتا ہے، پھر مرغی، پھر انڈا۔ اس کے بعد جب امام خطبے کے لیے آجاتا ہے تو وہ اپنے دفتر لپیٹ کر اس کی نصیحت سنتے ہیں۔[273]

عیدین کی نماز

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دن بھی مسلمانوں پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد اور زوال سے پہلے وہ جمعہ ہی کی طرح ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں۔ اس کا طریقہ درج ذیل ہے:

یہ نماز دو رکعت پڑھی جائے گی،

دونوں رکعتوں میں قرأت جہری ہوگی،

قیام کی حالت میں نمازی چند زائد تکبیریں کہیں گے،[274]

نماز کے لیے نہ اذان ہوگی اور نہ تکبیر کہی جائے گی،

نماز کے بعد امام حاضرین کی تذکیر و نصیحت کے لیے دو خطبے دے گا۔ یہ خطبے کھڑے ہو کر دیے جائیں گے۔ پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا۔

اس نماز کا خطاب اور اس کی امامت بھی نماز جمعہ کی طرح مسلمانوں کے ارباب حل وعقد ہی کریں گے اور یہ صرف انھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو ان کی طرف سے اس نماز کی جماعت کے لیے مقرر کیے جائیں گے اور جہاں وہ خود یا ان کا کوئی نمائندہ اس کی امامت کے لیے موجود ہوگا۔

نماز میں عورتیں بھی مردوں ہی کی طرح پورے اہتمام کے ساتھ شریک ہوں گی۔[275]

۲۷۲؎ بخاری، رقم ۸۴۳۔

۲۷۳؎ بخاری، رقم ۸۸۷۔ مسلم، ۹۴۴۔

۲۷۴؎ ان تکبیروں کی کوئی تعداد مقرر نہیں کی گئی۔ مسلمان اپنی سہولت کے مطابق قرأت سے پہلے یا اس کے بعد جتنی تکبیریں چاہیں، کہہ سکتے ہیں اور ان کے ساتھ رفع یدین بھی کر سکتے ہیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر پہلی رکعت میں سات، دوسری میں پانچ، اور بعض موقعوں پر دونوں رکعتوں میں چار چار تکبیریں کہی ہیں۔ (ابوداؤد، رقم ۱۱۴۹۔۱۱۵۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جنازہ کی نماز

مرنے والوں کے لیے جنازہ کی نماز بھی انبیا علیہم السلام کے دین میں ضروری قرار دی گئی ہے[۲۷۶]۔ میت کو نہلانے اور اس کی تجہیز و تکفین کے بعد یہ نماز جس طریقے سے ادا کی جائے گی، وہ یہ ہے:

میت کو اپنے اور قبلہ کے درمیان رکھ کر مقتدی امام کے پیچھے صف بنا لیں گے،

رفع یدین کے ساتھ 'اللّٰہ اکبر' کہہ کر نماز شروع کی جائے گی،

عیدین کی طرح اس نماز میں بھی چند زائد تکبیریں کہی جائیں گی،[۲۷۷]

قیام کی حالت ہی میں تکبیرات اور دعاؤں کے بعد سلام پھیر کر نماز ختم کر دی جائے گی۔

نماز جنازہ کا یہ طریقہ مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل کی جو روایتیں اس باب میں آئی ہیں، وہ ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنازہ جلدی لے جایا کرو، اس لیے کہ مرنے والا نیک ہے تو آگے بھلائی اس کی منتظر ہے جس کی طرف تم اسے بھیج رہے ہو، اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ایک برائی ہے جسے تم اپنی گردنوں سے اتار دو گے[۲۷۸]۔

ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تم جب جنازہ دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ اور جب تک وہ رکھا نہ جائے، اس کے ساتھ چلنے والے بھی اس وقت تک نہ بیٹھیں[۲۷۹]۔

ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص ایمان و احتساب کے ساتھ کسی مسلمان کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

---

۲۷۵ ام عطیہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ عورتوں کے بارے میں فرمایا: وہ نماز نہ پڑھیں، لیکن مسلمانوں کی جماعت اور ان کی دعا میں ضرور شامل ہو جائیں۔ (بخاری، رقم ۹۳۱)

۲۷۶ یہ عام حالات کا قانون ہے۔ کسی غیر معمولی صورت حال میں اگر نماز جنازہ کا اہتمام باعث زحمت ہو جائے تو میت کو اس کے بغیر بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ احد کے شہدا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر غسل اور نماز جنازہ کے بغیر ہی دفن کر دیا، اور پھر کئی برس کے بعد کسی وقت ان کے مقابر پر جا کر ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری، رقم ۱۲۷۸، ۱۲۷۹)

۲۷۷ ان تکبیروں کا حکم بھی وہی ہے جو اوپر عیدین کی تکبیروں کے متعلق بیان ہوا ہے۔

۲۷۸ بخاری، رقم ۲۵۲۔ مسلم، رقم ۹۴۴۔

۲۷۹ بخاری، رقم ۱۲۴۸۔

جنازے کے ساتھ چلتا ہے، پھر نماز جنازہ اور تدفین سے فراغت تک اس کے ساتھ رہتا ہے، وہ دو قیراط کے برابر ثواب حاصل کر کے لوٹتا ہے جن میں سے ہر قیراط اس طرح ہے، جیسے احد کا پہاڑ۔ اور جو نماز جنازہ تو پڑھتا ہے، مگر تدفین سے پہلے لوٹ آتا ہے، وہ بھی ان میں سے ایک قیراط لے کر واپس آتا ہے۔[۲۸۰]

انھی کی روایت ہے کہ جس دن نجاشی کا انتقال ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن اس کا اعلان کرایا، پھر لوگوں کے ساتھ نماز کی جگہ پہنچے، صفیں باندھیں اور نماز میں چار تکبیریں کہیں۔[۲۸۱]

ابن ابی لیلی بیان کرتے ہیں کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہمارے جنازوں پر بالعموم چار تکبیریں کہتے تھے۔ ایک جنازے پر انھوں نے پانچ تکبیریں کہیں۔ ہم نے پوچھا تو فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بعض موقعوں پر یہی کرتے تھے۔[۲۸۲]

طلحہ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیچھے جنازے کی نماز پڑھی تو انھوں نے اس میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت بھی کی، پھر فرمایا: میں نے یہ (تم لوگوں کو سنا کر) اس لیے پڑھی ہے کہ تمھیں معلوم ہو جائے کہ یہ حضور کا طریقہ ہے۔[۲۸۳]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ام المومنین سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مرنے والوں کو برا نہ کہا کرو، اس لیے کہ وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہاں پہنچنا تھا، پہنچ گئے۔[۲۸۴]

ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی کا جنازہ پڑھو تو خاص اس کے لیے دعا کرو۔[۲۸۵]

اس نماز کی جو دعائیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه، واعف عنه وعافه، واکرم نزله، ووسع مدخله، واغسله بماء وثلج وبرد، ونقه من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس، وابدله داراً خیراً من داره، واھلاً خیراً من اھله، وزوجاً خیراً من زوجه، وقه فتنة القبر وعذاب النار.[۲۸۶]

---

۲۸۰ مسلم، رقم ۹۴۵، ۹۴۶۔

۲۸۱ بخاری، رقم ۱۱۸۸۔ مسلم، رقم ۹۵۱۔

۲۸۲ ابوداؤد، رقم ۳۱۹۷۔

۲۸۳ بخاری، رقم ۱۲۷۵۔

۲۸۴ بخاری، رقم ۱۳۲۹۔

۲۸۵ ابوداؤد، رقم ۳۱۹۹۔

۲۸۶ مسلم، رقم ۹۶۳۔

''اے اللہ اس کو بخش دے، اس پر عنایت فرما، اس کو معاف کر دے، (پروردگار) اور اسے عافیت دے، اس کی بہتر مہمانی کر، اس کی قبر کو کشادہ کر دے، اسے پانی اور برف اور اولوں کے ساتھ دھو ڈال، اسے گناہوں سے پاک کر دے، بالکل اسی طرح، جیسے سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ (پروردگار)، تو اس کے گھر کو وہاں بہتر گھر سے، اور اس کے خاندان کو بہتر خاندان سے، اور اس کی بیوی کو بہتر بیوی سے بدل دے، اور اسے قبر کی آزمایش اور آگ کے عذاب سے نجات عطا کر دے۔''

۲۔ اللّٰھم اغفر لحینا ومیتنا، وصغیرنا وکبیرنا، وذکرنا وانثانا، وشاھدنا وغائبنا. اللھم من احییتہ منا فاحیہ علی الایمان، ومن توفیتہ منا فتوفہ علی الاسلام، اللھم لا تحرمنا اجرہ، ولا تضلنا بعدہ[۲۸۷].

''اے اللہ تو ہمارے زندوں کو بخش دے اور ہمارے مردوں کو بخش دے۔ اور ہمارے چھوٹوں اور بڑوں، اور مردوں اور عورتوں کو بخش دے۔ اور جو موجود ہیں، ان کو بخش دے اور جو موجود نہیں ہیں، ان کو بھی بخش دے۔ اے اللہ، تو ہم میں سے جسے زندگی دے، اسے اسلام کی زندگی عطا کر اور جسے موت دے، اسے ایمان کی موت عطا کر۔ اے اللہ، تو اس مرنے والے کے اجر سے ہمیں محروم نہ کر اور اس کے بعد ہم کو کسی فتنے میں نہ ڈال۔''

۳۔ اللّٰھم ان فلان بن فلان فی ذمتک وحبل جوارک، فقہ من فتنۃ القبر وعذاب النار، وانت اھل الوفاء والحمد، اللّٰھم فاغفرلہ وارحمہ، انک انت الغفور الرحیم[۲۸۸].

''اے اللہ، فلاں کا بیٹا فلاں اب تیری امان میں اور تیری پناہ کے عہد میں ہے۔ اس لیے، (پروردگار) تو اسے قبر کی آزمایش اور آگ کے عذاب سے بچا لے۔ تو حمد کا سزاوار ہے اور اس کا بھی کہ تیرے وعدے پورے ہوں۔ اِس لیے، اے اللہ، تو اس کو بخش دے اور اس پر عنایت کر۔ بے شک، تو بخشنے والا ہے، تیری شفقت ابدی ہے۔''

[باقی]

۲۸۷؎ ابوداؤد، رقم ۳۲۰۱

۲۸۸؎ ابوداؤد، رقم ۳۲۰۲۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

تہذیبوں کا تصادم: حیا کے میدان میں

نئی صدی میں پرانی جنگ

اکبر الہٰ آبادی اردو زبان کے ایک باکمال شاعر تھے۔ ان کی وجہ شہرت بالعموم ان کے طنزیہ اشعار ہیں۔ اکبر کا ایک مشہور قطعہ کچھ اس طرح ہے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

انھی کے طرز کی پیروی کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر — وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اکبر اور اقبال کے یہ اشعار اس کشمکش کا بہت اچھا بیان ہیں جو ہندوستان میں بیسویں صدی کے آغاز پر جدید مغربی رجحانات اور قدیم مشرقی روایات کے بیچ برپا ہوئی۔ یہ تہذیبی کشمکش آج کے دن تک جاری ہے اور ایک صدی میں بھی اس کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ ابتدا میں مغربی تہذیب کو کچھ غلبہ ہوا خاص طور پر ہماری اشرافیہ میں۔ تاہم اہل فکر و دانش اور مذہبی حلقوں کی بھرپور مزاحمت اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر ہمارے معاشرے میں مغربی تہذیب کا نفوذ ایک حد سے زیادہ نہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہو سکا۔ بیسویں صدی کے اواخر تک اس صورت حال میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تاہم پچھلے کچھ عرصے میں اس کشمکش نے ایک نیا رخ اختیار کیا ہے۔ انفارمیشن ایج کے آغاز اور نیو ورلڈ آرڈر کے تناظر میں مغربی تہذیب ایک نئی قوت کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہے۔ میڈیا کی طاقت نے گھر گھر میں مغربی اقدار و روایات کو پہنچا دیا ہے۔ دنیا پرستی کی لہر نے ہمارے ہر ذہین اور باصلاحیت شخص کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ قوم کے درد میں تڑپنے اور اپنی روایات کے لیے مرمٹ جانے والے اب ناپید ہیں۔ ہم میں پہلے جیسے اہل علم و دانش رہے ہیں نہ ہم ان اعلیٰ اخلاقی روایات کے امین رہے ہیں جو ہمارے لیے باعث تقویت تھیں۔ مذہبی قوتیں انتہا پسندی اور ظاہر پرستی کی اسیر ہو چکی ہیں اور اسی کے فروغ کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔

ان حالات میں اب یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ مغربی تہذیب کی یلغار سے ہم خود کو محفوظ کر سکیں۔ تاہم جو بات قابل اطمینان ہے، وہ یہ ہے کہ اہل مغرب کی اختیار کردہ ہر شے بری نہیں۔ انھوں نے متعدد چیزیں تو خود ہم مسلمانوں کے اچھے زمانوں کی اختیار کر رکھی ہیں۔ دوسری طرف ہماری تہذیب کی ہر چیز بھی آئیڈیل نہیں ہے۔ کتنے ہی غیر اسلامی اثرات ہیں جو ہندو تہذیب کے زیر اثر ہم میں در آئے ہیں، مثلاً جہیز اور شادی بیاہ کے بہت سے دیگر معاملات۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بحیثیت مجموعی ہم ایک ایسی جدید قوم ہیں جس کی اپنی تہذیب ابھی تشکیل کے مرحلے میں ہے۔ اس لیے مغرب اور مغربی تہذیب کے بعض مثبت اثرات کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ایسا ہونا تو ناگزیر ہے۔ ہمیں جس چیز کے لیے لڑنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی یہ یلغار ہماری ان اقدار و روایات کو بھی اپنے ساتھ نہ بہا لے جائے جن کی بنیاد دین فطرت یعنی اسلام پر ہے۔

انھی اقدار میں سے ایک بنیادی قدر عفت و عصمت ہے جس کی اساس فطرت انسانی میں موجود شرم و حیا کے بنیادی تصور پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اہل مغرب نے سب سے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ، علم و فن، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، رسوم و رواج غرض یہ کہ زندگی کے ہر میدان میں اس ٹھوکر کے اثرات بالکل واضح نظر آتے ہیں۔ بدقسمتی سے اب جبکہ ہمارے معاشرے کا ہر فرد براہ راست ان کی تہذیب کی زد میں ہے، عفت و عصمت اور شرم و حیا پر مبنی ہماری اقدار و روایات کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔ وی سی آر، ڈش انٹینا، کیبل اور انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے سے ہمارے بچوں اور نوجوانوں کے دل و دماغ میں جنسی بے راہ روی پر مبنی مغربی اقدار اور فکر و فلسفہ خاموشی سے سرایت کر رہا ہے۔ دوسری طرف ہماری اپنی تہذیب میں اس حوالے سے بہت سی غیر فطری پابندیاں اور غیر ضروری تصورات ایسے موجود ہیں جنھیں آج کے دور کا ایک معقول انسان اختیار کرنے کے لیے ذہناً تیار نہیں ہے۔ مغربی فکر اور تہذیب کی یلغار میں ان بے جا پابندیوں کو چھوڑتے چھوڑتے وہ عقل و فطرت اور دین و شریعت کی عطا کردہ بنیادی اقدار و روایات کو بھی ترک کر دیتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ نہ صرف مغربی تصورات پر تنقید کر کے لوگوں پر ان کی کمزوری واضح کی جائے، بلکہ اسلامی نقطۂ نظر کو بھی، افراط و تفریط سے ہٹ کر، درست طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ تحریر اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے کہ شرم و حیا ایک فطری انسانی جذبہ اور عفت و عصمت ایک بنیادی مذہبی قدر ہے۔لہٰذا مغرب کا کوئی ایسا اثر ہمیں قبول نہیں کرنا چاہیے جو ہماری اس بنیادی قدر کے خلاف ہو۔اس تحریر میں ہم نہ صرف اس بنیادی قدر کی تفصیلی اہمیت بیان کریں گے، بلکہ اس معاملے میں اہل مغرب کی کمزوری واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیں گے کہ اس ضمن میں دین کا نقطۂ نظر ہمارے نزدیک کیا ہے۔

ایک انسان دو تصورات

عفت و عصمت اور شرم و حیا کے متعلق ہمارے اور اہل مغرب کے اختلاف کی حقیقی نوعیت کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے، جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ ہمارا اور ان کا اختلاف اصلاً حیات و کائنات کے بنیادی تصورات سے متعلق ہے۔اہل مغرب کے نزدیک حیات اس بے خدا کائنات میں اتفاق سے وجود میں آئی۔ارتقا کے مختلف مراحل سے گزر کر آج وہ اس گروہ انسانیت کی صورت میں اپنا عروج دیکھ رہی ہے جو بحر و بر پر حکمرانی کے بعد ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی تیاری کر رہا ہے۔اہل مغرب، جو آج قافلۂ انسانیت کے امام ہیں، ان کے اس نقطۂ نظر کو قبول کرنا باقی دنیا کے لیے ناگزیر تھا۔بدقسمتی سے دین حق کے امین مسلمان بھی اپنے فکری زوال کی بنا پر عملاً اسی نقطۂ نظر سے متاثر ہو چکے ہیں۔تاہم اس نقطۂ نظر پر تنقید کرنے سے قبل اس کا پس منظر اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے، تاکہ ہم ان غلطیوں کے ارتکاب سے بچ سکیں جن کا شکار ہو کر اہل مغرب نے ٹھوکر کھائی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اہل مغرب کے اخلاقی بگاڑ کی اساس

مغربی تہذیب جس اخلاقی بگاڑ اور مادر پدر جنسی آزادی کے دور سے گزر رہی ہے وہ ایک دن میں اس مقام تک نہیں پہنچی۔اور نہ ایسا ہے کہ وہ فطری انسانی خوبیوں سے عاری ہو چکے ہیں کہ سب کچھ گنواتے گنواتے وہ شرم و حیا بھی گنوا بیٹھے۔ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر اخلاقی معاملات میں وہ بہت حساس ہیں۔دراصل اہل مغرب فکر و عمل کے اپنے ارتقائی سفر میں پیش آنے والے بعض حالات کی بنا پر انحراف کی اس منزل تک آ پہنچے ہیں۔پہلے وہ مذہب کے خلاف ہوئے اور پھر ان اقدار کو بھی زندگی سے نکال پھینکا جو تھیں تو بہت اعلیٰ، مگر مذہب کی بنیاد پر معاشرے میں قائم تھیں۔مذہب کا زوال ان اعلیٰ اخلاقی اقدار کے زوال کا بھی سبب بن گیا۔ذیل میں ہم اس معاملے کی کچھ تفصیل بیان کیے دیتے ہیں۔

مغربی فکر کے ارتقا سے واقف لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو ردعمل رائج عیسائی مذہب کے خلاف ہوا وہ بڑھتا ہوا انکار مذہب تک جا پہنچا۔اس صورت حال کے متعدد اسباب تھے۔جن میں سے عیسائی مذہبی عقائد و مسلمات کا

جدید سائنسی انکشافات کے خلاف ہونا، اہل کلیسا کا اپنے ان توہمات پر اڑ جانا اور پاپائیت کی اس بے لچک روش کے خلاف ردعمل بنیادی اسباب بن گئے، مثلاً مسیحی فکر میں زمین کو کائنات کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، کیونکہ یہ ان کے خدا کی جنم بھومی تھی، جبکہ سائنس کے نزدیک یہ بات خلاف واقعہ تھی، لیکن انھوں نے اس حقیقت کو ماننے کے بجائے سختی سے جدید خیالات کو دبانے کی کوشش شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں مذہب کے خلاف جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔

انیسویں صدی تک مغربی فکر کے لیے نظریاتی طور پر بھی خدا کو ساتھ لے کر چلنا مشکل ہو گیا۔ یہ بات طے ہو گئی کہ جدید انسان کو مذہب اور خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مگر رکاوٹ یہ تھی کہ انسان ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ انکار خدا کے بعد لازمی تھا کہ خدا کے بغیر انسان اور کائنات کی توجیہ کی جائے اور ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے یہ بتانا ضروری تھا کہ بغیر ایک خالق کے کائنات اور انسان کیسے وجود میں آئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن بھی اپنے منکرین کے سامنے یہی دو سوال رکھتا ہے: ''کیا یہ بغیر کسی خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں! کیا انھی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔'' (سورۂ طور ۵۲: ۳۵۔ ۳۶)

کائنات کا مسئلہ تو خیر آج کے دن تک حل نہیں ہو سکا، بلکہ الٹا (Big Bang Theory) نے اب اس بات کا پورا امکان سائنسی بنیادوں پر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کا آغاز جس دھماکے سے ہوا، وہ ایک خالق کی بیرونی مداخلت کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوا۔ البتہ اس زمانے میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی صورت میں خدا کے بغیر انسان کی توجیہ کی ایک شکل لوگوں کے سامنے آ گئی۔ حال یہ ہوا کہ ڈارون کو 'The man who killed the God' کا خطاب مل گیا۔ نظریۂ ارتقا کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب، اس کی تمام تر علمی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود، یہی تھا کہ اس نے سائنسی بنیادوں پر خدا سے ہٹ کر انسان اور حیات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پھر کیا تھا سماجی، عمرانی، نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی علوم کے ماہرین کی ایک فوج انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اس اصول کی روشنی میں کام کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی کہ انسان ایک بے خدا اور ارتقا یافتہ حیوان ہے۔ ان علوم میں سے دو ایسے تھے جن سے موجودہ جنسی بے راہ روی کی فضا ہموار ہوئی۔ پہلا علم نفسیات تھا۔ فرائڈ نے اس پر کام کیا اور جنس کے جذبے کو بنیاد بنا کر تمام انسانی اعمال و اعتقادات کی تشریح کر ڈالی اور اسی بنیادی جبلت کو زندگی کی روح رواں قرار دیا۔

اس سے کہیں زیادہ اثر اس علمی کام کا ہوا جو انسانی تہذیب پر کیا گیا۔ اس میں دکھایا گیا کہ جنسی اخلاقیات کا ماخذ فطرت یا مذہب نہیں، بلکہ معاشی نظام ہے جو شکار سے زراعت اور زراعت سے صنعت تک پہنچا ہے۔ اس علم کے مرتبین نے یہ بتایا کہ انسانی معاشروں میں ابتداءً مرد و عورت کے تعلقات مکمل جنسی آزادی کے اصول پر قائم تھے، مگر جب انسان نے شکار سے زراعت کے عہد میں قدم رکھا تو زمین کی انفرادی ملکیت کا نظریہ پیدا ہوا۔ ایک مرد کو زمین پر کام کاج کرنے کے لیے کام کرنے والوں کی ضرورت پڑی۔ ان کارکنوں کے حصول کا بہترین ذریعہ اولاد تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شادی کے

بندھن سے خاندان کا ادارہ وجود میں لایا جائے جس میں عورت کی وفاداریاں صرف ایک مرد سے وابستہ ہوں اور اس سے ہونے والی اولاد صرف اسی کی ملکیت ہو۔ عورت کے ایک مرد کی ملکیت ہونے کے اسی تصور سے عصمت اور حیا کے تصورات پیدا ہوئے، تاکہ ان پابندیوں سے عورتوں کی لگام ہمیشہ مردوں کے ہاتھ میں رہے، جبکہ مردوں نے خود کو ہمیشہ ان زنجیروں سے آزاد رکھا ہے۔

دور جدید میں انسان زراعتی دور سے نکل کر صنعتی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ پیداواری عمل میں نہ صرف انسانوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے، بلکہ عورت خود معاشی طور پر مکمل آزاد ہے۔ لہٰذا اس تحقیق کی رو سے اب نہ کسی عورت کے ایک مرد سے وابستہ رہنے کی کوئی ضرورت ہے نہ شادی کی۔ نہ عصمت کوئی قابل لحاظ شے ہے نہ حیا کی کوئی اہمیت ہے۔

معاشرے میں اس انحراف کو سہارا دینے اور پروان چڑھانے والی ایک اور چیز یہ تھی کہ اہل مغرب کے نزدیک فرد کی آزادی زندگی کی سب سے بلند، غیر متنازع اور مسلمہ انسانی قدر بن گئی۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اگر معاشرے کے افراد اپنی جنسی تسکین کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کریں تو معاشرے کو اس پر اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ عریاں فلموں اور رسالوں، شادی کے بغیر جنسی تعلقات اور ہم جنس پرستی وغیرہ کی راہ معاشرے میں ہموار ہوگئی اور کسی کے پاس کوئی جواز نہ رہا کہ وہ معاشرے کے افراد کو جنسی انحرافات اختیار کرنے سے روکے یا انھیں اس معاملے میں کسی اجتماعی نظم کا پابند بنائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی بگاڑ کی عملی وجوہات

نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں تبدیلیوں کا جو عمل شروع ہوا، وہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی تک بہت تیز ہو گیا۔ صنعتی انقلاب نے معاشرتی اقدار پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ دیہی زندگی تیزی سے شہری زندگی میں بدلنے لگی۔ مشینوں کے شہر میں عورت مرد جتنی ہی مفید کارکن تھی۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی افرادی قوت کی طلب کے جواب میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ میدان عمل میں اترنے لگیں۔ مرد و زن کے اختلاط کے مواقع کثرت سے پیدا ہو گئے۔ بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں میں مرنے والے کروڑوں لوگوں میں زیادہ تر مرد تھے۔ ان کی کمی پوری کرنے کے لیے مزید خواتین میدان میں آئیں۔

بیسویں صدی میں تجارتی مسابقت کی فضا میں نت نئی مصنوعات مارکیٹ میں آرہی تھیں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ صارفین کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو۔ عورت کو یہ توجہ پہلے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ خواتین کارکنوں کا ایک نیا استعمال وجود میں آیا اور اشتہارات کی صنعت میں خواتین کی نسوانی کشش کا بے دریغ استعمال کیا جانے لگا۔

جو نیا میڈیا ایجاد ہوا اس نے اپنی مقبولیت کی سب سے آسان راہ یہ ڈھونڈی کہ انسانوں کے سفلی جذبات کو بھڑکایا جائے۔ اخبارات، رسالے، فلم، ٹی وی اور اب انٹرنیٹ ہر ایک کی مقبولیت کا راز اسی ٹوٹکے میں پوشیدہ ہے۔ وہ رسالے اور

فلمیں جو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے وقف ہیں، خود ایک بہت کامیاب کاروبار ثابت ہوئے۔

فکر و عمل کے اس پس منظر میں مغربی معاشرہ عفت و عصمت کے تصورات کو گنوا بیٹھا ہے۔ وہ ذہنی سکون جو ایک شریک حیات سے ملتا ہے؛ خوشی اور غم میں شریک، کھونے اور پانے میں شریک، ہنسنے اور رونے میں شریک، اہل مغرب اس شریک حیات کو ترستے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ عرصۂ جوانی میں کب اس کے شریک سفر کو کوئی اور بھا جائے اور وہ یکسانی سے تنگ آ کر نئے ہم سفر کی تلاش میں نکل جائے۔ خاندان کی وہ ڈھال جو عفت و عصمت کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے اور جس کی پناہ میں بچے اور بوڑھے اپنی تمام تر ناتوانی کے ساتھ عافیت سے زندگی بسر کرتے ہیں، وہاں بہت کمزور ہو چکی ہے۔ گو مادی سہولتوں کی فراوانی، انسانی جان کی اہمیت کے شعور اور ریاست کے ہر فرد کی ذمہ داری کو اٹھا لینے کی بنا پر وہاں صورت حال اپنی تمام تر سنگینی کے باوجود قابو سے باہر نہیں ہوئی۔ تاہم مغربی تہذیب کے فریب میں آ کر اگر ہمارے ہاں یہ صورت حال پیدا ہوئی تو ہماری بربادی میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، کیونکہ ہم ان دیگر مثبت اقدار سے پہلے ہی فارغ ہو چکے ہیں جو مغربی معاشرے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہماری آخری پناہ گاہ یہی خاندان ہے جو اگر ٹوٹ گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان کا اسلامی تصور

مغربی نقطۂ نظر کے برخلاف اسلام ہمارے سامنے انسان کا جو تصور رکھتا ہے، وہ کسی ارتقا یافتہ حیوان کا نہیں ہے۔ قرآن نے حضرت آدم کے قصے میں انسان کی ابتدا سے متعلق تمام ضروری تفصیلات سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ اس قصے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق نے انسان کو ایک باشعور اور بااقتدار ہستی کے طور پر اس دنیا میں بھیجا۔ یہاں اس کی آمد ایک خدائی منصوبے کے تحت ہوئی ہے۔ جس میں انسان کو اس دنیا میں رہتے ہوئے خدا کی ابدی جنت کے حصول کے لیے کوشش کرنی ہے۔ جنت کی اس شان دار کامیابی کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بن دیکھے اپنے رب کے احکام کی پابندی کرے اور اس کی نافرمانی سے محفوظ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھیجنے سے قبل انسانوں کے ماں باپ حضرت آدم اور حضرت حوا کو تربیت کی غرض سے ایک باغ میں رکھا۔ یہاں انھیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ البتہ ایک خاص ''درخت'' کے پاس جانے سے انھیں روکا گیا تھا۔ شیطان جو ان کا دشمن تھا اس معاملے میں انھیں فریب دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دھوکا دے کر ان دونوں کو اس ''درخت'' کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہٹا دیا، مگر انھوں نے توبہ کر کے شیطان کے اس وار کو ناکام بنا دیا۔

ہمارے موضوع کے اعتبار سے اس قصے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ شیطان نے دھوکا دینے کے لیے انسان کے جس جذبے کو استعمال کیا، وہ جنس تھا۔ اس نے قسمیں کھا کر انھیں اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا، مگر اس کی وسوسہ اندازی کا اصل مقصد

یہی تھا کہ ان کی شرم کی جگہیں جو ان سے چھپی تھیں ان کے سامنے ظاہر کر دے۔ وہ دونوں اس کی باتوں میں آ گئے جس کے نتیجے میں ان کی شرم گاہیں عریاں ہو گئیں۔ قرآن اس معاملے کو احتیاط سے بیان کرتا ہے، مگر اس کے اشارے اس معاملے کی اصل حقیقت کی طرف صاف رہنمائی کرتے ہیں۔

اس قصے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان پہلے ہی دن سے خیر و شر کے تمام تصورات سے آگاہ تھا۔ اس میں شرم و حیا کا جذبہ فطری طور پر موجود تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شیطان کے فریب سے نکلنے کے بعد آدم و حوا نے جو پہلا کام کیا تھا، وہ اپنے جسم کو پتوں سے ڈھانپنا تھا۔

چنانچہ اسلام کا جو تصور انسان ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو اس کے رب نے دنیا میں آزمایش کے لیے بھیجا ہے۔ یہاں اس کا مقصد اپنے دل میں پیدا ہونے والی ہر خواہش کو پورا کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ جگہ تو جنت کی ہے جہاں اس کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ اس دنیا میں تو انسان کو اپنے رب کی فرماں برداری کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ اسے اختیار رکھتے ہوئے اپنی آزادی پر کچھ پابندی گوارا کرنی ہوگی۔ کچھ چیزوں سے رکنا ہوگا اور شیطان کی تمام تر وسوسہ اندازی کے باوجود اپنے رب کی اطاعت پر قائم رہنا ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسانی معاشرے میں حیا کی اہمیت

امتحان کی اس دنیا میں انسان کی ایک عظیم ترین آزمایش جنسی معاملات میں درست رویہ اختیار کرنا ہے۔ جنس انسانی جبلت میں موجود ایک بہت طاقت ور حیوانی جذبہ ہے۔ انسانوں میں اس تقاضے کو رکھے جانے کی اپنی مصلحتیں ہیں جن کی طرف ہم آگے چل کر اشارہ کریں گے، مگر اس بے لگام تقاضے کو قابو میں رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی میں اتنا ہی طاقت ور جذبہ حیا کی صورت میں رکھا ہے۔ اکبر نے بڑی خوبی سے ایک شعر میں اس بات کو بیان کیا ہے:

ہوئیں آغاز جوانی میں نگاہیں نیچی
نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

حیا کا یہ فطری جذبہ صرف جنسی تقاضے ہی کو قابو میں نہیں رکھتا، بلکہ معاشرے کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ معاشرے میں اقدار کا پورا نظام اور رشتوں میں پائے جانے والے لحاظ اور تقدس کی بنیاد یہی حیا کا جذبہ ہے۔ انسانی تہذیب کا تمام تر حسن رشتوں کے اسی حفظ مراتب اور اقدار کے اسی نظام میں پوشیدہ ہے، وگرنہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

انسان حیا کے اسی جذبے کی بنا پر اپنے بزرگوں کا لحاظ کرتا ہے، محرمات کو مقدس جانتا ہے، خواتین کی عزت کرتا ہے، احباب سے مروت سے پیش آتا ہے، بزرگوں کا پاس کرتا ہے، کمزوروں کی رعایت کرتا ہے، معاشرتی دباؤ محسوس کر کے برائی

سے رکتا ہے، خدائی احکام اور انسانی اقدار کی خلاف ورزی سے باز رہتا ہے۔ غرض حیا نہ ہو تو انسانی معاشرہ اگلے ہی لمحے حیوانوں کے ریوڑ میں تبدیل ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی زندگی میں حیا کی اسی اہمیت کو یوں بیان کیا ہے:

''جب تم حیا نہ کرو تو پھر جو تمھارا جی چاہے کرو۔'' (بخاری)

خاندان: معاشرت کی بنیاد

حیا کے اسی فطری انسانی جذبے سے عفت و عصمت کی بنیادی قدر پیدا ہوتی ہے۔ یہ قدر اس لیے بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ دین معاشرت کی اساس خاندان کو بناتا ہے، جبکہ خاندان کا ادارہ عفت و عصمت کو ایک مسلمہ قدر بنائے بغیر نہ وجود میں آ سکتا ہے اور نہ باقی رہ سکتا ہے۔ معاشرے میں خاندان کی اہمیت اس انسانی عجز کی بنا پر ہے جو اسے بچپن اور جوانی میں درپیش ہوتا ہے۔ بچپن اور بڑھاپے میں انسان کی محتاجی کوئی ایسی غیر معروف حقیقت نہیں ہے جس کے بیان کے لیے صفحات سیاہ کرنے پڑیں۔ یہ ہر شخص کے مشاہدے کی بات ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے طے کیا کہ نوجوانوں کے مضبوط قویٰ پر بچوں اور بوڑھوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے۔ اس مقصد کے لیے عورت کی جس ملائمت اور مرد کی جس قوت کی ضرورت تھی اسے اکٹھا کرنے کے لیے دونوں میں جنس کا ایک غیر معمولی طاقت ور داعیہ رکھ دیا جو انھیں باہم جڑ کر رہنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسلامی قانون معاشرت میں جنس کے اس جبلی جذبے کو نکاح کے مستقل رشتے کے ذریعے سے ایک مرد و عورت تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ انھی مرد و عورت سے مل کر خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے جو مسلم معاشرت کی بنیادی اکائی ہے۔ سوسائٹی میں عفت و عصمت کے فروغ اور جنسی جذبات پر قابو رکھنے کی تربیت کے لیے خاندان کے اندر یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ تمام قریبی رشتوں کی حرمت کو ابدی قرار دے کر انھیں جنس کے شائبے سے بھی پاک کر دیا جاتا ہے۔

ایک مسلم معاشرے کی اساس خاندان کے اسی ادارے پر اٹھتی ہے۔ یہاں بچوں کی ذہنی نشوونما ایک ایسے پاکیزہ ماحول میں ہوتی ہے جہاں شہوانیت سے پاک محبت اور مفادات سے بلند قربانی کے مظاہر جنم لیتے ہیں۔ یہ خاندان ان معصوم بچوں کی تربیت گاہ بھی ہوتا ہے جو اس تعلق سے وجود میں آتے ہیں اور ان بزرگوں کی پناہ گاہ بھی ہوتا ہے جو پہلے ہی اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کر چکے ہوتے ہیں۔ خاندان کی اسی اہمیت کی بنا پر دین تفصیل کے ساتھ ان معاملات کو موضوع بحث بناتا ہے جن کا تعلق خاندان کے استحکام سے ہے۔

زنا کی بیخ کنی

زنا رشتوں پر اس اعتماد کی جڑ کاٹ دیتا ہے جس کے نتیجے میں ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ والدین انھی بچوں کے لیے ہنس کر دکھ جھیلتے ہیں جن کے متعلق انھیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ان کی اپنی اولاد ہے۔ اسی طرح لوگ اپنے ہی والدین کی خدمت کے لیے دن رات ایک کر سکتے ہیں۔ تمام محرم رشتوں کا تقدس بھی اسی اعتماد پر قائم ہوتا ہے۔ معاشرے میں جب زنا پھیلتا ہے تو یہ تمام رشتے مشکوک اور خاندان کا ادارہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یوں بچے اپنی بنیادی تربیت گاہ اور بزرگ اپنی آخری پناہ گاہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عفت و عصمت وہ قدر ہے جو معاشرے میں زنا کے فروغ کے خلاف بند باندھتی ہے۔ لہٰذا دین نے زنا کی بیخ کنی کو باقاعدہ اپنا موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ ایسے احکام دیے ہیں جن کے نتیجے میں عفت و عصمت مسلم معاشرے کی ایک زندہ قدر بن جاتی ہے۔

اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے جنسی تعلق کو نکاح کے رشتے تک محدود کر دیا ہے۔ زنا کو شرک اور قتل کے ساتھ ابدی سزا کا جرم قرار دیا ہے۔ دنیا میں بھی زنا کی انتہائی سخت سزا مقرر کی ہے۔ اس معاملے میں انسانوں کی کمزوری کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے زنا کے ساتھ ساتھ ان چیزوں پر بھی روک لگائی ہے جو اسے زنا میں مبتلا کر سکتی ہیں۔ چھپے یا ظاہر ہر قسم کے فواحش سے اسے روکا ہے۔ معاشرے میں فواحش پھیلانے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔ معاشرے کے غیر شادی شدہ افراد کے نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ مرد و زن کے اختلاط کے ایسے احکام دیے گئے ہیں جن سے فریقین کے بے راہ ہونے کے امکانات کم و بیش معدوم ہو جاتے ہیں۔ ان تمام احکام کے نتیجے میں حیا کے فطری انسانی جذبے کو پھلنے پھولنے کا بھرپور موقع ملتا ہے اور عفت و عصمت مسلم معاشرے کی بنیادی قدر بن جاتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حیا کے معاملے میں افراط و تفریط

حیا کا جذبہ چونکہ فطرت انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے، اس لیے کسی دور میں بھی انسانی معاشرے اس تصور سے خالی نہیں رہے۔ انسان کی کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ حیا کے تقاضوں کو پورا کرنے میں وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ آج کا مغربی انسان بھی حیا سے کلی طور پر محروم نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے تمام تر بگاڑ کے باوجود مغرب میں عفت و عصمت کے بعض مظاہر موجود ہیں۔ اہل مغرب اس معاملے میں تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں عفت و عصمت اب ایک قدر کے طور پر ختم ہو چکی ہے جس کے بعد خاندان کا ادارہ مسائل کا شکار ہو چکا ہے۔

دوسری طرف ہماری تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ دور زوال میں ہم افراط کے رویے کا شکار ہو چکے ہیں۔ یعنی ہم حیا کے نام پر

کچھ ایسی پابندیاں اپنے لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں جو دین کے مطالبے سے بھی زیادہ ہیں اور جن کا اختیار کرنا نہ صرف عادتاً مشکل ہے، بلکہ انھیں اپنانے کے بعد فرد کی معاشرتی زندگی غیر فطری طور پر محدود ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرد کے پاس صرف دو راہیں بچتی ہیں۔ یا تو وہ ان کی خلاف ورزی کر کے احساس جرم اور منافقت کے ساتھ زندگی گزارے یا پھر انھیں اپنا کر باقی معاشرے سے کٹ جائے۔ ہمارے معاشرے کی اکثریت نے پہلی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احساس جرم میں مبتلا ہو کر لوگ نہ صرف پورے دین سے دور ہو رہے ہیں، بلکہ مغربی تہذیبی یلغار کے لیے تر نوالہ بھی بن رہے ہیں۔

اس پس منظر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ وہ دینی مطالبات بیان کر دیے جائیں جو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان مرد و عورت کے سامنے رکھے ہیں۔

مرد و زن میں اختلاط کے احکام

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مرد و زن میں اختلاط کے احکام دیے ہیں۔ پردہ و حجاب کے برعکس ہم نے ''مرد و زن میں اختلاط'' کی اصطلاح اس لیے استعمال کی ہے کہ ہمارے نزدیک مرد و زن کا اختلاط دین میں فی نفسہٖ حرام نہیں ہے۔ ایسا ہونا انسانی معاشروں میں تو ناگزیر ہے، البتہ غاروں اور جنگلوں میں بن باس لینے والوں کو اس سے سابقہ پیش آنا ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد و زن کے اختلاط کے مواقع روزمرہ زندگی میں ہر گھر میں پیش آتے ہیں۔ دین چونکہ انسانی معاشروں میں رہنے والے عام لوگوں کے لیے نازل ہوا ہے، اس لیے وہ اسے حرام قرار دینے کے بجائے کچھ حدود مقرر کر دیتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جس طرح دین جنسی تعلق کو مطلقاً حرام قرار دینے کے بجائے اسے میاں بیوی کے تعلق تک محدود کر دیتا ہے۔ سورۂ نور کی آیات ۳۰۔۳۱ میں بیان کردہ ان حدود و احکام کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

o مرد و زن کا سامنا ہو تو دونوں کو اپنی نگاہوں کو بچا کر رکھنا چاہیے، اس سے مراد یہ ہے کہ نگاہوں میں حیا ہو، گھور کر نہ دیکھا جائے، خد و خال کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس سے مراد یقیناً یہ نہیں کہ ہر وقت نگاہ نیچی رکھی جائے۔ ان آیات میں 'مِنْ اَبْصَارِھِمْ'، 'یعنی اپنی نگاہوں میں سے بعض کو نیچا رکھیں' کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہے۔

o لباس میں عریانی کا کوئی پہلو ظاہر نہ ہونے پائے۔ بعض اوقات اٹھتے بیٹھتے اس سلسلے میں بے احتیاطی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں خصوصی احتیاط کرنی چاہیے۔

مذکورہ بالا دونوں احکام عورت مرد، دونوں کو دیے گئے ہیں۔ مردوں کے برعکس خواتین میں دو چیزیں اضافی طور پر پائی جاتی ہیں۔ ایک ان کے سینے کا صنفی اعضا میں شامل ہونا دوسرے ان کا زیب و زینت اختیار کرنا۔ ان دونوں کا اظہار چونکہ مردوں کے لیے کشش کا باعث ہوتا ہے، اس لیے خواتین کو اس ضمن میں خصوصی احکام دیے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

o عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ اس موقع پر اپنی زیب و زینت کی کوئی شے ظاہر نہ ہونے دیں۔ اس سے وہ زیبایش

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

البتہ مستثنیٰ ہے جو عادتاً کھلی رہتی ہے۔

o خواتین با اہتمام اپنے سینے کو اوڑھنی وغیرہ سے ڈھانک کر رکھیں تاکہ سینہ کا ابھار ظاہر نہ ہو اور نہ گلے میں پہنا ہوا کوئی زیور یا گریبان ظاہر ہو۔

o خواتین کے سینے کے مقابلے میں جس کی کشش صنفی نوعیت کی ہوتی ہے، زیب و زینت جمالیاتی اعتبار سے باعث کشش ہوتی ہے۔ اس جمالیاتی پہلو کا اظہار اگر اعتماد کے قریبی لوگوں تک محدود رہے تو باعث فساد نہیں ہوتا۔ چنانچہ خواتین کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ اپنے قریبی حلقے کے لوگوں میں، جن کی فہرست آیت میں دی گئی ہے، زینت کا اظہار کر سکتی ہیں۔

ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ اس ضمن میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیا ہے۔ جو لوگ تفصیلات کے طالب ہیں وہ جاوید احمد غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' کے باب قانون معاشرت میں اسی عنوان کے تحت مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان احکام کے ساتھ وہاں سورۂ احزاب میں آنے والے بعض احکام کا پس منظر بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ جن کو درست طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر ہمارے ہاں افراط کا وہ رویہ پیدا ہوا جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حیا و عفت کو کمزور کرنے والے اسباب

مغرب کے برخلاف جہاں عفت و عصمت ایک اخلاقی قدر کے طور پر باقی نہیں رہی، ہمارے معاشرے میں الحمد للہ آج تک یہ ایک بنیادی قدر ہے۔ تاہم انسانی اقدار نہ ایک دن میں بنتی ہیں نہ ایک دن میں ختم ہوتی ہیں۔ یہ نسلوں میں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ خاص طور پر عفت و عصمت کی مضبوط قدر کسی سوسائٹی میں اس قدر آسانی سے ختم نہیں ہوتی۔ پہلے مرحلے پر انسان میں موجود شرم و حیا کا جذبہ کمزور ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب عفت و عصمت کی قدر لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعت ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ جس کے نتیجے میں آج اگر یہاں سے حیا رخصت ہو رہی ہے تو لازمی ہے کہ کل یہاں سے عصمت و پاک دامنی کا جنازہ بھی اٹھے گا۔

تہذیبوں کے تصادم میں حیا کا میدان ہی وہ جگہ ہے جہاں ہمیں سب سے زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان وجوہات کا جائزہ لیا جائے جن کی بنا پر مغرب کے تہذیبی سیلاب کے سامنے ہماری یہ بنیادی قدر خطرے میں پڑ چکی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وجوہات درج ذیل ہیں۔

مغربی میڈیا کی یلغار

مغرب نے صنعتی دور کے آغاز پر اپنی مشینی قوت کے سہارے اہل مشرق کی طاقت کو زیر و زبر کر کے ان کی زمین پر قبضہ کیا

تھا۔آج انفارمیشن ایج کے آغاز پر وہ میڈیا کے بل بوتے پر مشرقی اذہان وتہذیب کو مفتوح کر رہا ہے۔مغرب کی پہلی یلغار اہل مشرق کے وسائل پر قبضے کے لیے تھی۔اس کی دوسری یلغار بھی بلاشبہ مادی منفعت کے کئی پہلو لیے ہوئے ہے،مگر اب اسے یہ زعم بھی ہے کہ اس نے انسانیت کی معراج کو چھو لیا ہے۔یہ بات کئی اعتبارات سے ٹھیک بھی ہے،مگر معاشرت کے میدان میں اہل مغرب نے کچھ نہیں کیا سوائے اس کے کہ انسان کو دو پاؤں پر چلنے والے حیوان کے مقام پر پہنچا دیا۔اب وہ یہ چاہتا ہے کہ باقی دنیا بھی اس کے اس نقطۂ نظر کو قبول کر لے۔

اس معاملے میں مغربی فکر نے جو کچھ ٹھوکر کھائی،اسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور وہ نظری میدان میں ہمیں شکست بھی نہیں دے سکتا،مگر اب میڈیا کے سہارے یہ بغیر کسی بحث ومکالمے کے عملاً ہمارے ہر فرد کو اپنا اسیر بنا رہی ہے۔یہ ٹھوکر کھائی ہوئی تہذیب ہمارے گھروں پر دستک ہی نہیں دے رہی،بلکہ ہمارے بیڈروم میں بھی داخل ہو چکی ہے۔یہ تہذیب اپنی اقدار،روایات،آداب اور اخلاق فلم،ٹی وی،رسالوں اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے معاشرے کے ہر طبقے تک پہنچا رہی ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ لوگ سستی تفریح کے حصول کے لیے مغربی میڈیا کو اپنے گھروں میں آنے دیتے ہیں،مگر اس کے ساتھ عریانیت اور فواحش لوازم کے طور پر گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔آہستہ آہستہ یہ دیکھنے والوں کے دل ودماغ کو آلودہ کرنا شروع کرتے ہیں۔ان کی آنکھوں سے حیا رخصت ہوتی ہے۔عصمت و پاک دامنی اپنی وقعت کھو دیتی ہے۔کسی نادیدنی پر پہلے پہل چینل بدلے جاتے ہیں۔پھر یہ امر زحمت اور وہ منظر معمولی لگنے لگتا ہے۔آخر کار باپ بیٹی،بہن بھائی سب یکساں طور پر 'تہذیب یافتہ' ہو جاتے ہیں۔اکبر نے گو تہذیب کے حوالے سے بات کسی اور موقع کے لیے کہی تھی،مگر یہاں اسے دہرانا بے محل نہ ہوگا:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حیا اِن کو نہیں آتی اُنھیں غصہ نہیں آتا

اس سلسلے میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی بالعموم ایک حد ہوتی ہے۔انٹرنیٹ جہاں زمان ومکان کے دیگر حدود سے ماورا ہے،حیا کی پامالی میں بھی اس کے حدود وثغور کی کوئی انتہا نہیں۔اس کے مثبت استعمال بلاشبہ بہت ہیں،مگر جس قوم میں مطالعہ کا رواج نہ ہونے کے برابر ہو،وہاں انٹرنیٹ کے فروغ کی ایک بنیادی وجہ ہر طرح کے جنسی مواد تک باآسانی رسائی ہی محسوس ہوتی ہے۔

ایسے ماحول میں ممکن ہے کہ موجودہ نسل کے افراد کی اقدار نہ بدلیں،مگر اگلی نسلیں حیا اور عفت کو چھوڑ کر مغربی اقدار نہ اپنائیں،ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نکاح میں تاخیر

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جنس کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی حکمت کے تحت انسانوں میں رکھا ہے۔ تاہم اس کی تسکین کا ایک جائز راستہ نہ صرف اس نے مقرر کیا ہے، بلکہ معاشرے میں نکاح کے فروغ کی بڑی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ سورۂ نساء اور سورۂ نور کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ معاشرے کا کوئی فرد بھی غیر شادی شدہ نہ رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ اس معاملے میں انسان کے بھٹکنے کا امکان کتنا ہے۔ جس معاشرے کے نوجوانوں کی اکثریت غیر شادی شدہ ہو وہاں زنا کے فروغ کے لیے ایک بنیاد پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے۔ یہ نہ بھی ہو تو معاشرے میں شہوانی افکار و اعمال کا پھیلنا لازمی ہے۔

بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی اس معاملے میں ایک ناقابل رشک صورت حال کا شکار ہے۔ معاشرتی رسوم اور معاشی مسائل نے شادی کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ اب تو مغربی نقطۂ نظر کے تحت لوگوں میں یہ ذہن عام ہو چکا ہے کہ شادی پختہ عمر تک پہنچ کر ہی کرنی چاہیے، کم عمر لوگ اس ذمہ داری کو نہیں اٹھا سکتے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ وقت پر شادی نہ ہونے سے ہمارے معاشرے میں حیا اور عفت کی اقدار بری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ ایک طرف مغربی میڈیا کی پھیلائی ہوئی شہوانیت اور دوسری طرف اپنی فطری تسکین سے محروم غیر شادی شدہ لوگوں کی کثرت۔ نتیجہ بالکل واضح ہے۔ لوگ بے راہ روی کا شکار نہ بھی ہوں تب بھی حیا کا فطری جذبہ ان کے اندر کمزور اور عصمت و عفت ان کی نگاہ میں بے وقعت سی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ شادی کے بعد بھی اپنی نگاہ اور ذہن کو آلودگی سے نہیں بچا پاتے اور نہ وہ اس کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مرد و زن کا بے حجابانہ اختلاط

ہمارے زوال پزیر معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ یہ صنعتی اور اطلاعی دور میں بیک وقت داخل ہوا ہے۔ چنانچہ انفارمیشن ایج کے نقصان دہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ صنعتی دور کے بعض ان مسائل سے بھی ہمارا سامنا ہے، جنھیں مغرب نے انیسویں صدی میں بھگتا تھا۔

صنعتی دور کے معاشی تقاضوں اور اطلاعی دور کی نئی اقدار کی بنا پر خواتین تیزی سے گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر میدان میں حصہ لے رہی ہیں۔ مخلوط نظام تعلیم ہمارے ہاں تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ سماجی تقریبات اب کلی طور پر مخلوط ماحول میں منعقد کی جا رہی ہیں۔ دفتروں میں بھی خواتین کی تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

مرد و زن کا یہ اختلاط جن حالات میں ہو رہا ہے ان میں سے کچھ کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ کچھ ایسی چیزیں بھی

معاشرے میں فروغ پا رہی ہیں جن کا ذکر ہم اوپر مغرب کے بگاڑ کی عملی وجوہات کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم مرد و زن کے اختلاط کے ان احکام سے سرے سے واقف ہی نہیں جو ہمارے مذہب نے ہمیں دیے ہیں۔اس میں جو کردار اہل مذہب کا ہے، ہم اس کے حوالے سے کچھ معروضات آگے پیش کریں گے، مگر ان سب کا یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ معاشرے میں حیا کی لرزتی دیواریں زیادہ عرصہ تک عصمت کے بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکیں گی۔مرد و زن کی دوستی، ڈیٹنگ، چیٹنگ، لوافیئر، ویلنٹائن ڈے وغیرہ معاشرے کی نئی اقدار بن رہی ہیں۔یہ اقدار جب بنتی ہیں تو حیا اور عفت کے ستونوں کو زمیں بوس کر کے ان کے ملبہ ہی پر وجود میں آتی ہیں۔یہی مغرب میں ہوا اور یہی ہمارے ہاں ہوگا۔

اہل مذہب کا غلط رویہ

ہمارے ہاں اہل دین کا یہ بڑا مسئلہ بن گیا ہے کہ جب وہ دین بتانے جاتے ہیں تو چند ہی چیزوں کو بنیاد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ٹوپی، داڑھی، برقع وغیرہ اس معاشرے میں تقوے کی ایسی محکم اساسات بن چکی ہیں کہ ان کا تارک ایمان کے آخری مقام پر بھی کھڑا ہوگا تو بے دین کہلائے گا اور ان کا عامل اخلاق و معاملات کی ہر گندگی میں لتھڑا ہونے کے باوجود بندۂ مومن کے لقب سے شادمان کیا جائے گا۔اسی پس منظر میں مغربی تہذیب کے فروغ کا سارا نزلہ خواتین کی بے پردگی ہی پر گرتا ہے۔وہ جب بھی بھولے بھٹکے دین کی طرف مائل ہوتی ہیں تو پہلا مطالبہ برقع پہننے کا ہوتا ہے۔پھر اس کے ساتھ دینی مطالبات کی ایسی فہرست سامنے آتی ہے کہ جس پر عمل کرنا انھیں انگاروں پر چلنے سے کم مشکل محسوس نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ معاشرے کے ایک عام فرد سے شرم و حیا کے وہ مطالبات منوانا جن کا ذکر آج اہل مذہب کی طرف سے ہوتا ہے، بہت مشکل ہے۔عورت صرف گھر میں رہے، گنتی کے چند محرم رشتہ داروں کے سوا کسی کے سامنے نہ آئے، چہرہ ہی نہیں آنکھیں اور ہاتھ بھی ڈھانپ کر رکھے، آواز کو بھی پردے میں رکھے اور کبھی ظاہر کرے تو اتنے سخت لہجے میں کہ سننے والے کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے، ایسے مطالبات ہیں جو اسٹیج سے کیے جا سکتے ہیں، کتابوں میں لکھے جا سکتے ہیں، دینی حلقوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں، مگر ہمارے معاشرے کے عام آدمی سے ان کا منوانا ممکن نہیں۔ہم معذرت کے ساتھ کہیں گے کہ ایسی باتیں کرنے والوں نے گہری نگاہ سے دین کو سمجھنے کی کوشش کی ہے نہ انسانی معاشرے کو۔وہ اس معاملے میں قدیم فقہا کی آرا سے واقف ہیں نہ جدید معاشرے کی اٹھان سے۔نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے پر ان کے بے پناہ اثر کے باوجود ان کی باتوں کو معاشرے کی محدود اقلیت کے سوا کوئی سننے کے لیے تیار نہیں۔

یہاں یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ دین نے جو احکام اس ضمن میں دیے ہیں وہ ہر دور میں قابل عمل ہیں۔ہم ان کی تفصیل اوپر بیان کر چکے ہیں۔انھیں اختیار کرنے سے معاشرت متاثر ہوتی ہے نہ دور جدید کے پیدا کردہ بعض تقاضوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ہمارا معاشرہ ابھی اتنا نہیں بگڑا کہ دین کی حقیقی تعلیمات اختیار کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہو۔البتہ اس

میں تدریج کا خیال رکھنا چاہیے۔ پہلے مرحلے ہی پر مرد و زن کے اختلاط سے متعلق احکام منوالینا اور انھی پر زور دینا اصلاح کا درست راستہ نہیں ہے۔ صحیح دینی تصورات، آخرت کی محبت اور قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو سچا خدا پرست بنانا اہل دین کی پہلی ترجیح ہونی چاہیے ۔ جب لوگوں میں ایک حد تک ایمانی شعور پیدا ہو جائے گا تو وہ خود ہی دین کے احکام قبول کر لیں گے۔اس کے برعکس ان ناممکن العمل مطالبات کا سلسلہ جاری رکھا گیا یا حقیقی احکام کو بھی پہلا دینی مطالبہ بنایا گیا تو دین کے قریب کرنے کے بجائے ہم لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب بن جائیں گے۔

صحت مند تفریح کا فقدان

ہمارے معاشرے کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ یہاں لوگوں بالخصوص نوجوانوں کے لیے کسی قسم کی صحت مند تفریح کی فراہمی کسی کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔نوجوانی کے زمانے میں انسان کی توانائیاں نقطۂ عروج پر ہوتی ہیں۔انھیں مثبت انداز میں استعمال کرنا ان کی شخصیت کے ارتقا اور ذہنی نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہوتا ہے۔جبکہ ہمارے ہاں ان کھیلوں کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں جو ان کی توانائیاں نچوڑ لیں اور انھیں نڈھال کر ڈالیں۔اسی طرح مطالعے کی وہ روایت بھی یہاں موجود نہیں جو انسان کو اعلیٰ درجے کی ذہنی تفریح فراہم کر سکتی ہے۔ لے دے کے جو سب سے بڑی تفریح بچتی ہے وہ الیکٹرانک میڈیا سے محظوظ ہونا ہے۔اس سلسلے میں مغربی میڈیا کے علاوہ ہمارے اپنے مقامی میڈیا کا کردار بھی انتہائی منفی ہے۔ابلیس نے آدم کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ حسد میں آکر کیا تھا۔میڈیا کے لوگ اپنے مالی مفادات کے خاطر ابن آدم کے ساتھ یہی کچھ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ انسان کے صنفی جذبات کو بھڑکا کر، اس کے جذبۂ ہوس کی تسکین کر کے، اس کی نگاہوں کو آلودگی کے اسباب مہیا کر کے اپنے ناظرین کی تعداد بڑھاتے ہیں۔ جو آخر کار ان کی آمدن میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔

میڈیا کی فراہم کردہ اس واحد تفریح سے متاثر ہو کر، جس کا تعلق جنس ہی سے ہوتا ہے، جو واحد عملی جدوجہد ایک نوجوان کرتا ہے، وہ اکثر و بیشتر رومانس کے میدان میں ہوتی ہے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس جدوجہد میں جو چیز سب سے پہلے قدموں تلے آکر کچلی جاتی ہے، وہ حیا اور عفت کی اقدار ہی ہیں۔

تربیت کے نظام کا ختم ہو جانا

مذکورہ بالا حالات کو زیادہ سنگین بنانے والی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں انسانوں کی تربیت کے وہ تمام ادارے کم و بیش معطل ہو چکے ہیں جو معاشرے کی اقدار و روایات کو اگلی نسلوں تک پہنچاتے اور ان کے تحفظ کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔اس سلسلے کی سب سے بنیادی ذمہ داری والدین کی ہے، مگر ہمارے ہاں خود والدین، الا ماشاء اللہ، غیر تربیت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یافتہ ہوتے ہیں تو وہ بچوں کی تربیت کیا کریں گے۔ عام طور پر بچوں کو اچھا کھلانا، پہنانا، گھمانا اور کسی انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دلانا ہی ماں باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ جس کے بعد والدین کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ بچے اپنے تمام تر فارغ وقت میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں اور وہی ان کی حقیقی تربیت کرتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ والدین کے علاوہ ہر خاندان اور محلے میں ایسے نیک سیرت بزرگ ہوا کرتے تھے جن کی صحبت میں سب لوگ اعلیٰ اخلاق کی تربیت حاصل کیا کرتے تھے۔ جدید دور میں ایسے بزرگ اب ناپید ہیں۔ اسی طرح اچھے دنوں میں استاد بننا پیشہ نہیں ایک مشن ہوتا تھا۔ اساتذہ لوگوں کی زندگیوں پر اپنی تربیت کے ان مٹ نقوش ثبت کیا کرتے تھے، مگر اب حال یہ ہے کہ اساتذہ تعلیم دینے کی اپنی ذمہ داریاں بھی پوری طرح ادا نہیں کرتے اور والدین کو اسکول کے ساتھ ٹیوشن کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں تربیت جیسے بھاری بوجھ کو اٹھانا اسکول کے ان 'ملازموں' کے لیے کیسے ممکن ہے؟

معاشرتی اقدار کے تحفظ کی آخری ذمہ داری حکومت کے سر ہوتی ہے، مگر ہمارے ہاں حکومتیں صحت، روزگار اور تعلیم جیسی بنیادی ذمہ داریوں میں دلچسپی نہیں لیتیں تو اقدار کے تحفظ پر ان کی کیا توجہ ہوگی؟ اس معاملے میں زیادہ بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں اہل اقتدار کی پرداخت مغربی اقدار ہی کے تحت ہوتی ہے۔ یہ خود اس بات کے خواہش مند ہیں کہ مغربی اقدار معاشرے میں فروغ پائیں۔ چنانچہ ان سے اپنی اقدار کے تحفظ کی توقع ایسے ہی ہے جیسے بلی کو دودھ کی رکھوالی کے لیے مقرر کیا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسئلہ کا حل

سوال یہ ہے کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟ عصر حاضر میں دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ ہم شتر مرغ کی طرح اپنا سر ریت میں چھپا کر مغربی تہذیبی یلغار کو نہیں روک سکتے۔ نہ مغربی تہذیب کے خلاف پروپیگنڈا کر کے اپنے لوگوں کو اس کی برائی سے بچایا جا سکتا ہے۔ ظاہر پرستانہ دین داری بھی اس سیلاب کے آگے بند نہیں باندھ سکتی۔

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کا واحد حل لوگوں کے سامنے آخرت کی نجات اور دنیا میں تزکیۂ نفس کا وہ نصب العین رکھنا ہے جو دین نے ان کے لیے مقرر کیا ہے۔ ہمارے دینی تصورات کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان میں دین کا نصب العین تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ ظاہر پرستی کے اس دور میں کوئی فرد کے ظاہری حلیے کی تبدیلی کو مقصد دین سمجھتا ہے اور کوئی حکومت واقتدار کی سطح پر اسلامی سزاؤں کے نفاذ کو فرد کی تگ ودو کا محور بنا دیتا ہے۔ حالانکہ دین اس معاملے میں بالکل صریح ہے کہ آخرت میں نجات کے لیے اس دنیا میں فرد کو جو چیز حاصل کرنی ہے، وہ اپنے نفس کی پاکیزگی ہے۔ ناپاک لوگوں کا انجام جہنم کا کوڑا خانہ ہی ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کامیاب ہوا جس نے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔'' (الشمس ۹۱: ۹-۱۰)

”بے شک وہ کامیاب ہوا جس نے خود کو پاک کیا۔“ (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴)

قرآن بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد نفوس انسانی کا تزکیہ تھا اور اسی لیے دین و شریعت کی ساری تعلیمات دی گئی ہیں۔ (الجمعہ ۶۲: ۳)

چنانچہ ضروری ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کیا جائے کہ ان کی نجات اپنے نفس کو پاکیزہ بنانے میں ہے۔ آخرت کی کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان کا ذہن، دل، دماغ اور نگاہ اگر آلودہ ہو، ہوس کی اسیر ہو، شہوت کی غلام ہو، نفسانیت میں لتھڑی ہو تو ایسا شخص اس قابل نہیں رہتا کہ وہ جنت کی ابدی بادشاہت میں داخل کیا جائے۔ جس شخص میں آخرت کی کامیابی کا شوق پیدا ہو جائے اور وہ اس کے حصول کا راستہ جان لے، وہ مغرب کی آغوش میں رہ کر بھی پاکیزہ زندگی گزارے گا اور جس شخص کے سامنے یہ نصب العین نہیں آیا، وہ سات پردوں میں رہ کر بھی اپنے نفس کو آلودہ کر دے گا۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

امام محمد بن اسماعیل بخاری

امام بخاری کا اصل نام محمد اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بروزبہ ہے۔ ان کے جداعلیٰ بروزبہ مجوسی تھے اور فارس کے رہنے والے تھے۔ امام صاحب کے جدامجد مغیرہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے خاندان میں سے اسلام قبول کیا۔ امام صاحب کے والد اسماعیل ثقاہت کے اعتبار سے چوتھے درجے کے معتبر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ امام صاحب ۱۹۴ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصلی وطن بخارا ہے۔ امام صاحب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، چنانچہ ان کی والدہ ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر مکہ معظّمہ چلی گئیں اور انھوں نے وہیں نشوونما پائی اور اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تحصیل علم

امام صاحب کی تحصیل علم کا زمانہ بچپن ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر توجہ کی اور امام وکیع اور امام ابن مبارک جیسے اساتذۂ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو حدیث کے مقدس فن کی طرف متوجہ ہوئے جس کی پریشان اور پراگندہ حالت ان کی آیندہ توجہ اور سرپرستی کا انتظار کر رہی تھی۔ اگرچہ اس تفصیل کا حال معلوم نہیں ہو سکا کہ امام صاحب نے کن مشائخ سے فن حدیث کی تعلیم حاصل کی، لیکن اس قدر مسلم ہے کہ ان کا فضل و کمال زیادہ تر اسحاق بن راہویہ اور علی مدینی کے فیضان تعلیم کا نتیجہ ہے۔

شیوخ واساتذہ

امام صاحب کے اساتذہ میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں:

ضحاک بن مخلد، عبیداللہ بن موسیٰ عبسی ، عبدالقدوس بن حجاج خولانی، محمد عبداللہ انصاری، اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی۔

امام صاحب کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز اور شام میں اس وقت کا کوئی ایسا محدث نہ تھا جس سے امام صاحب نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو۔ ان کے تمام شیوخ کی مجموعی تعداد ایک ہزار اسی ہے۔

امام بخاری نے طلب حدیث میں دو مرتبہ ملک شام اور مصر کا دورہ کیا۔ چار مرتبہ بصرہ گئے۔ کئی مرتبہ کوفہ اور بغداد کا سفر کیا۔ حجاز مقدس میں چھ سال قیام کیا۔ آپ ایام حج میں مکہ معظّمہ چلے جایا کرتے تھے۔

مجلس درس

امام صاحب کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا۔ مجلس درس کبھی گھر میں منعقد ہوتی کبھی مسجد میں۔ جب آپ نیشا پور گئے تو وہاں آپ کی تدریسی خدمات کا ذکر قدرے تفصیل سے ملتا ہے۔ نیشا پور میں آپ کا استقبال ایک بڑے معروف عالم اور عظیم محدث کی حیثیت سے کیا گیا۔ امام مسلم آپ کے اس استقبال کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''امام بخاری جب نیشا پور میں تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا کہ والیان ملک اور سلاطین کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام صاحب نیشا پور پہنچ کر درس و تدریس حدیث میں مصروف ہو گئے۔ علمائے شہر اکثر اوقات حاضر ہوا کرتے اور امام صاحب کی معلومات حدیث سے مستفیض ہوتے۔ خود امام مسلم کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کی روزانہ کی مجلس کبھی ان سے خالی نہ ہوا کرتی تھی۔ ایک دن امام صاحب کی جامعیت اور تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار امام صاحب کی پیشانی کو چوم لیا اور جوش میں آ کر کہا:

''اے ملک حدیث کے بادشاہ مجھے اپنے قدم چومنے کی اجازت دے۔''

امام محمد بن یحییٰ ذہلی اس پائے کے شخص تھے کہ امام مسلم کے استاد اور نیشا پور کے مانے ہوئے محدث تھے۔ انھوں نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دے دیا تھا کہ امام صاحب کی مجلس تدریس میں حاضر ہوا کریں۔ خود امام صاحب کی شہرت اور فضل و کمال نے اس طرح لوگوں کو گرویدہ کر لیا کہ امام ذہلی جیسے بزرگوں کی مجلسیں بے رونق ہو گئیں۔

تلامذہ

امام بخاری سے کسب فیض حاصل کرنے والے چند قابل ذکر نام یہ ہیں:

امام ترمذی، امام مسلم، ابراہیم بن اسحاق الحری، محمد بن احمد دولابی۔

امام بخاری کے درس کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔امام بخاری سے براہ راست نوے ہزار آدمیوں نے جامع صحیح کو سنا۔

تصنیفات

کتاب الجامع الصحیح (صحیح بخاری)،التاریخ الکبیر،التاریخ الصغیر،الجامع الکبیر،التفسیر الکبیر،کتاب العلل۔

ان تصنیفات کے علاوہ مزید سولہ کتب کے نام بھی ملتے ہیں۔

علما کی شہادت

جن علمانے آپ کی تحسین وتوصیف کی ہے،ان میں آپ کے اقران (ساتھی) اورشیوخ واساتذہ سب شامل ہیں:

امام بخاری کی تحسین وتوصیف کرنے والوں میں ان کے ہم عصر علما کے علاوہ ان کے شیوخ واساتذہ بھی شامل ہیں:

امام احمد فرماتے ہیں کہ سرزمین خراسان نے امام بخاری جیسا شخص پیدانہیں کیا۔ابن المدینی فرماتے ہیں: امام بخاری نے خود بھی اپنے جیسا شخص نہیں دیکھا تھا۔محمود بن نظر بن سہیل شافعی فرماتے ہیں کہ میں بصرہ،شام اور حجاز جاکر وہاں کے علما سے مل چکا ہوں، سب امام بخاری کو اپنے سے افضل قرار دیتے ہیں۔امام مسلم نے ان کے سامنے انھیں امیر المومنین فی الحدیث قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان سے دشمنی وہی شخص رکھ سکتا ہے جو حاسد ہو۔میں شہادت دیتا ہوں کہ دنیا میں ان کا ثانی موجود نہیں ہے۔امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے عراق اور خراسان میں کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو احادیث کی تاریخ وعمل اور اسانید کی جان پہچان میں امام بخاری سے بڑھ کر ہو۔ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ آسمان کے نیچے محمد بن اسماعیل بخاری سے بڑھ کر حدیث کا حافظ وعالم نہیں دیکھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وفات

امام صاحب نے بخارا میں ایک مدت تک راحت اور آرام سے زندگی بسر کی۔لیکن آخری زمانے میں شاہ بخارا آپ پر ناراض ہو گیا اور بخارا سے آپ کو نکلنے کا حکم دے دیا۔امام صاحب بخارا سے نکل کر خرتنگ چلے گئے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ جلاوطنی کا انھیں بہت افسوس تھا۔وفور غم سے بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتا کہ الٰہی باوجود وسعت کے میرے لیے زمین تنگ ہو گئی ہے،لہٰذا اب تو مجھے اٹھالے۔عجیب اتفاق ہے کہ یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے آپ کو دنیا سے اٹھالیا۔٢٥٦ ہجری شوال کی چاندرات میں انتقال ہوا اور عید کے دن نماز کے بعد آپ کی تجہیز وتکفین ہوئی۔

آپ کی وفات کی خبر جب سمرقند میں مشہور ہوئی تو ایک کہرام مچ گیا۔اس شان سے جنازہ اٹھا کہ سارا سمرقند مشایعت میں ساتھ ساتھ تھا۔ بڑے بڑے علما اور امرا باچشم پرنم نماز جنازہ میں شریک تھے۔نماز ظہر کے بعد دفن کر دیا گیا اور آسمان

حدیث کا یہ منور آفتاب سرزمین سمرقند میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

مناقب

امام صاحب کی مقدس زندگی میں ایسی اعلیٰ خصوصیات پائی جاتی تھیں، جن سے عام طور پر بڑے بڑے نامور لوگوں کا دامن خالی ہوا کرتا ہے۔ وہ خودداری، سادگی، قناعت، انکساری، رواداری اور بے تعصبی جیسی خوبیوں سے پوری طرح متصف تھے۔

امیر بخارا کی یہ خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے دربار میں آ کر صحیح بخاری اور تاریخ کبیر سنائیں۔ امام صاحب کی خودداری نے اسے رد کر دیا اور کہا کہ میں علم کو رسوا کرنا نہیں چاہتا، اگر امیر کو سچا شوق ہے تو میری مجلس میں آ کر شریک ہو۔ امام صاحب نے عمر بھر کبھی اس کی کوشش نہیں کی کہ عام علما کی طرح کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں۔ امام صاحب کی اس خودداری کے ساتھ ساتھ ان کی انکساری کا یہ عالم ہے کہ ان کے شیوخ میں ان کے ہم عمر اور ہم سبق لوگوں کے نام نظر آتے ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

''عروج وزوال کا قانون اور پاکستان''

مصنف: ریحان احمد یوسفی،

ضخامت: ۱۷۶ صفحات،

قیمت: ۱۲۰ روپے،

ناشر: دار التذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلمانوں کا قومی زوال اب ہر شخص کے لیے معلوم و معروف واقعہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کا مشاہدہ قوم کے ارباب نظر ہی کر رہے تھے، مگر قومی ہزیمت کے پے در پے واقعات نے اسے مشہود حقیقت کی حیثیت سے عوام الناس کے سامنے بھی عیاں کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملی حمیت رکھنے والا ہر فرد صورت احوال سے دل گرفتہ اور قومی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے مضطرب نظر آتا ہے۔ یہ دل گرفتگی اور اضطراب اس پہلو سے خوش آئند ہے کہ کارواں کے دل میں احساس زیاں پیدا ہو گیا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے قوم اس سطح پر نظر آتی ہے کہ اگر اسے صحیح رہنمائی میسر ہو تو وہ اسباب زوال کو جان کر ان کے تدارک کی تدبیر کر سکتی اور تعمیر و ترقی کی راہوں پر گام زن ہو سکتی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ قائدین کی اکثریت قوم کے شعور کو بیدار کرنے کے بجائے اس کے جذبات کو انگیخت کر رہی ہے اور اسے ان راستوں کی طرف دھکیل رہی ہے جو سرتاسر بربادی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ان حالات میں جن معدودے چند لوگوں نے قوم کے شعور کو بیدار کرنے کا علم بلند کیا ہے، ان میں ایک نمایاں نام جناب ریحان احمد یوسفی کا ہے۔ ''عروج وزوال کا قانون اور پاکستان'' ان کی گراں قدر تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے اہل اسلام، بالخصوص اہل پاکستان کو ان حقائق سے آگاہ کرنے کی سعی کی ہے جو قوموں کے عروج وزوال اور ان کی فنا و بقا کے حوالے سے علوم قرآنی اور علوم تاریخ میں مسلم ہیں اور جن سے آگاہی کے بعد ہی کوئی

قوم اپنی تعمیر وترقی کے راستوں کو متعین کر سکتی ہے۔ یہ تصنیف جذبات کو انگیخت کرنے کی عام روش سے ہٹ کر قوم کے شعور کو بیدار کرنے کی کاوش ہے اور اس کے بارے میں مصنف کی یہ توقع بالکل بجا ہے کہ یہ فکری جمود کی فضا میں ارتعاش کا پہلا پتھر ثابت ہوگی:

''مجھے یہ یقین ہے پچھلی دو صدیوں میں جو غیر علمی اور جذباتی فضا ہمارے ہاں پروان چڑھی ہے اس میں ایسی کسی تحریر سے قوم کی ذہنیت میں کسی انقلاب کے رونما ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ تاہم اتنی امید ضرور ہے کہ یہ تحریر جمود کی اس فضا میں ارتعاش کا پہلا پتھر ضرور ثابت ہوگی۔'' (۱۲)

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے کو مصنف نے مختلف بنیادی اور ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ حصۂ اول کا عنوان ہے: ''عروج و زوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں''۔ اس عنوان کے تحت پہلے عروج و زوال کا مفہوم اور اس کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ فرد اور قوم، دونوں کو اپنی زندگی میں عروج و زوال سے سابقہ پیش آتا ہے۔ فرد جب شباب کے عروج اور پیری کے زوال سے گزرتا ہے تو گویا وہ زبان حال سے عروج و زوال کے ابدی قانون ہی کی داستان سناتا ہے۔ قوم بھی اسی طرح طفولیت، شباب اور کہولت کے ادوار سے گزرتی ہے۔ اس بحث میں چند باتیں اساسی اصول کی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ عروج و زوال ایک تدریجی عمل ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ عمل اسباب و عوامل پر منحصر ہے اور تیسرے یہ کہ یہ ان قوانین سے متصل ہے جو اذن خداوندی سے دنیا میں جاری وساری ہیں۔

دوسری بحث عروج و زوال کے ان مراحل کے بارے میں ہے جو قوموں کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اس بحث کی تمہید میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اقوام خواہ سپر پاور کی حیثیت رکھتی ہوں یا کسی سپر پاور کے ماتحت ہوں، وہ بہرحال عروج و زوال کے عمل سے گزرتی ہیں، ماتحت اقوام کا یہ عمل البتہ بڑی طاقتوں ہی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس موقع پر مصنف نے عام طور پر پائے جانے والے اس تاثر کی نفی کی ہے کہ عالمی طاقتوں کا وجود کوئی حالیہ واقعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک یا ایک سے زیادہ سپر پاورز کا موجودہ معاملہ صرف آج شروع ہوا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب انسانوں نے گروہوں کی شکل میں رہنا شروع کیا تھا اور آج کے دن تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ مصری، ایرانی، یونانی، رومی، عرب، ترک، یورپین، روسی اور اب امریکی سب اسی سلسلۂ عروج و زوال کی کڑیاں ہیں۔'' (۲۳)

قوموں کے عروج و زوال کو مصنف نے ۷ مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا مرحلہ ''دور تشکیل'' ہے۔ اس مرحلے میں کوئی قوم مختلف عوامل کے نتیجے میں معرض وجود میں آتی ہے۔ اسی موقع پر قوم کی نفسیات اور مزاج تشکیل پاتا ہے۔ یہی نفسیات اور یہی مزاج اگلے مراحل میں قوم کے رویوں کو متعین کرتا ہے۔ دوسرا مرحلہ ''تعمیر و شناخت کا دور'' ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب قوم کے مختلف گروہ باہمی طور پر اس قدر مربوط ہو جاتے ہیں کہ ان کی شناخت ایک ہو جاتی ہے۔ اسی موقع پر قومی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عصبیت جنم لیتی ہے جو یک جہتی کے لیے بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔اسی مرحلے میں مصلحین پیدا ہوتے ہیں اور ان کی رہنمائی میں قوم اپنے لیے ایک واضح لائحۂ عمل متعین کرتی ہے۔تیسرا مرحلہ ''دور ترقی و استحکام'' ہے۔تعمیر و شناخت کے کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد ترقی اور استحکام کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔اس زمانے میں جدید ضرورتوں کے مطابق نظام وضع ہوتے اور ادارے فروغ پاتے ہیں اور قوم معاشی استحکام اور فلاح و بہبود کے لحاظ سے عظمت کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔ اس مرحلے میں اگر قوم کے سامنے کوئی داخلی یا خارجی چیلنج نہ آئے تو وہ ایک لمبے عرصے تک ترقی کی پرسکون زندگی گزار کر دور انحطاط میں داخل ہو جاتی ہے، لیکن اگر اسے کوئی چیلنج پیش آجائے تو پھر یہیں سے اس کے چوتھے مرحلے یعنی ''دور عروج و کمال'' کا آغاز ہو جاتا ہے۔خارجی یا داخلی چیلنج کے مقابلے میں قوم اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ سرگرم عمل ہوتی ہے اور بالعموم کامیابی سے ہم کنار ہوتی ہے۔اس کامیابی کے بعد وہ قوموں کی حکمرانی کے منصب پر فائز ہو جاتی ہے اور عسکری، سیاسی، معاشی اور تہذیبی پہلوؤں سے اس کا غلبہ دوسری اقوام پر مسلم ہو جاتا ہے۔پانچواں مرحلہ ''دور انحطاط'' ہے۔یہ مرحلہ عروج کے مرحلے سے بالکل متصل ہوتا ہے۔اس دور میں افراد قوم عیش و عشرت اور فارغ البالی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں اور قوم زوال کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔چھٹا مرحلہ ''دور زوال'' ہے۔اس دور میں اندرونی خلفشار کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر دیگر اقوام تاخت شروع کر دیتی ہیں۔اسی موقع پر قوم دوسری اقوام کی محتاجی اختیار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ساتواں اور آخری مرحلہ ''تباہی اور خاتمہ'' ہے۔یہ دور زوال کا منطقی انجام ہے۔اس مرحلے میں قوم اپنی شناخت کے لحاظ سے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

حصۂ اول میں تیسری بحث کا عنوان ''عروج و زوال کے عمل میں مختلف گروہوں کی اہمیت'' ہے۔اس بحث میں مصنف نے قومی زندگی کے جملہ اجزاے ترکیبی کی نوعیت اور مختلف پہلوؤں سے ان کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔مصنف کے نزدیک یہ اجزاے ترکیبی قائدین، اشرافیہ، عوام الناس اور ادارے ہیں۔ان میں سے اہم تر قائدین ہیں۔یہ قائدین فکری، مذہبی اور سیاسی، تینوں دائروں میں ہوتے ہیں۔مصنف کے نزدیک:

> ''کسی قوم کے عروج و زوال کا بہت حد تک انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اسے اچھے قائدین میسر ہیں یا نہیں۔قومی جسد میں قائدین کی حیثیت دماغ کی سی ہوتی ہے۔انسانی جسم میں دماغ پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے اور ہر طرح کے حالات میں جسم کے عمل یا ردعمل کا تعین کرتا ہے۔اسی طرح قائدین قومی زندگی کے ہر مرحلے پر قوم کے اندر اور باہر سے اٹھنے والے ہر چیلنج کے جواب میں قوم کا ردعمل متعین کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ عام حالات میں وہ قومی زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھتے ہیں۔''(۴۱)

پہلے حصے کی چوتھی بحث کا موضوع ''عروج و زوال کے عوامل'' ہے۔اس بحث کو مصنف نے غیر اختیاری عوامل اور اختیاری عوامل کے عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔غیر اختیاری عوامل سے مراد وہ عوامل ہیں جو قوم کے ارادہ و اختیار کے ماتحت نہیں

ہوتے۔ان میں سے ایک قوم کی اندرونی توانائی ہے اور دوسرا خارجی چیلنج ہے۔اختیاری عوامل بھی دو ہیں۔ایک اخلاقی اقدار کی پابندی اور دوسرا جدید ٹیکنالوجی پر عبور ہے۔اس بحث پر حصۂ اول مکمل ہو جاتا ہے۔

حصۂ دوم میں عروج و زوال کے قانون کو قرآن مجید کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔اس حصے کے پانچ ذیلی مباحث ہیں۔ان کے عنوان ''قرآن اور عروج و زوال کا قانون''، ''رسولوں کی اقوام کے بارے میں عروج و زوال کا قانون''، ''امت مسلمہ سے متعلق عروج و زوال کا ضابطہ''، ''آل ابراہیم کا عروج و زوال ــــــ تاریخ کی روشنی میں'' اور ''آل ابراہیم کے بعد'' ہیں۔پہلی بحث مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ قرآن مجید اصلاً تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔یہ انسانوں کی ہدایت کی کتاب ہے۔اس میں اقوام عالم کے عروج و زوال کا ذکر ضرور آیا ہے، مگر ان کا تاریخی پہلو ضمنی ہے۔اس ضمن میں بنیادی چیز اللہ کی براہ راست ہدایت پانے والی اقوام کے حوالے سے عروج و زوال کے ضوابط ہیں۔مصنف کے نزدیک ان اقوام کی دو اقسام ہیں: ایک رسولوں کی مخاطب قومیں اور دوسری امت مسلمہ۔ان اقوام کے عروج و زوال کا معاملہ عام قوانین سے بالکل مختلف ہے۔اسے قرآن مجید نے بالتفصیل بیان کیا ہے۔مصنف کے نزدیک ان اقوام کے حوالے سے عروج و زوال کا قانون اور اس کے اطلاقات ختم نبوت کے بعد ختم ہو چکے ہیں۔مصنف نے اس بحث کے اختتام پر اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں واضح کیا ہے کہ یہ مدرسۂ فراہی کے علما کی تحقیقات پر مبنی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''اس باب میں ہمارے نقطۂ نظر کی اساس قرآن پر غور و فکر کی اس روایت پر مبنی ہے جس کی طرح پچھلی صدی کے ایک جلیل القدر عالم حمید الدین فراہی نے ڈالی تھی۔پہلی تحقیق ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی اور دوسری تحقیق اصلاحی کے شاگرد جاوید احمد غامدی کے قرآن پر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ہم نے قوموں کے عروج و زوال پر اس کا اطلاق کر کے ایک منطقی ربط کے ساتھ پیش کیا ہے۔'' (۷۳)

اس حصے کی دوسری بحث میں رسولوں کی اقوام کے بارے میں عروج و زوال کا قانون بیان کیا گیا ہے۔اس ضمن میں سب سے پہلے انبیا کا مقصد بعثت بیان کیا گیا ہے۔یعنی وہ انذار اور بشارت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں اور اہل ایمان کو جنت کی خوش خبری سناتے ہیں اور منکرین کو جہنم کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔انبیا میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ رسالت کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔نبی اور رسول میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نبی کے مخاطبین کے انجام کا فیصلہ تو قیامت تک کے لیے موخر رہتا ہے، مگر رسول کے مخاطبین کا فیصلہ اسی دنیا میں برپا ہو جاتا ہے۔مصنف نے اس کی تفصیل اس طرح کی ہے:

> ''نبی اور رسول میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی کے اتمام حجت کے بعد اس کا نتیجہ دنیا میں نکلنا ضروری نہیں ہوتا، لیکن ایک رسول کے اتمام حجت کے بعد دنیا ہی میں اس کی مخاطب قوم کی مہلت عمر کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نبی لوگوں کو صرف حق پہنچانے تک محدود رہتا ہے۔وہ آسمان سے وحی کی ہدایت پاتا ہے اور اہل زمین کو اس حق پر مطلع کرتا ہے۔اس کا یہ ابلاغ حق اس قدر واضح ہوتا ہے کہ لوگ قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ صحیح بات ان پر واضح نہ تھی۔تاہم ان کی تکذیب و نافرمانی کے نتیجے میں ان کی مخاطب قوم پر کوئی عذاب نہیں ٹوٹتا۔حتیٰ کہ ان کی قوم اگر انھیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قتل کر ڈالے تب بھی ان پر سزا کا فوری نفاذ ضروری نہیں ہوتا۔

تاہم رسول کا معاملہ اس سے ایک قدم آگے ہوتا ہے۔ قرآن سے ہمارے سامنے جو تصویر آتی ہے، اس کے مطابق کسی قوم کی طرف ایک رسول کی بعثت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عدالت جو دوسروں کے لیے قیامت کے دن لگنی ہے، اس رسول کی مخاطب قوم کے لیے دنیا میں لگ چکی ہے۔ رسول، ایک نبی کی طرح نہ صرف اپنی قوم کو اخروی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے بارے میں بتاتے ہیں، بلکہ اس دنیا میں اپنے پیروکاروں کو کامیابی کی بشارت دیتے اور کفر و نافرمانی پر دنیا میں ہی اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے رب کا پیغام باصراحت لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور جب ان کی قوم ان کی بات نہیں مانتی تو لازماً اس دنیا میں ہی خدا کے عذاب کا کوڑا اس قوم پر برس جاتا ہے اور وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔ تاہم اگر رسولوں کی بات مان لی جائے تو پھر دنیا میں ہی ان پر خدا کی رحمتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا کہ دنیا میں قوم کا عروج و زوال اب صرف اس رسول سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک رسول جب اپنی قوم کو حق سے آگاہ کرتا ہے تو اس کا کیا ہوا اتمام حجت اس درجہ کا قطعی ہوتا ہے کہ اس کے بعد قیامت کے انتظار کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ رسول کی مخاطب قوم کو دنیا میں ہی ان کے کفر کی پاداش میں فنا کر دیتا ہے۔'' (۷۷)

اس موقع پر جملۂ معترضہ کے طور پر قرآن میں لفظ ''رسول'' کے استعمال پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد مختلف آیات کے حوالے سے رسولوں کے اتمام حجت اور اس کے نتیجے میں کفار پر نازل ہونے والے عذاب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بحث کے اختتام پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ چونکہ نبوت و رسالت کا دور ختم ہو گیا ہے، اس لیے رسولوں کے حوالے سے قوموں کے عروج و زوال کا باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے:

''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی اب یہ قانون قیامت تک کے لیے ختم ہو گیا۔ اب کسی رسول نے آنا ہے نہ کسی نبی نے۔ اس لیے دنیا میں کسی قوم کے عروج و زوال کے لیے اب اس قانون کے کسی پہلو کا کوئی اطلاق نہیں ہو سکتا۔'' (۸۷)

حصۂ دوم کی تیسری بحث کا موضوع ''امت مسلمہ سے متعلق عروج و زوال کا ضابطہ'' ہے۔ اس بحث کے تحت پہلے امت مسلمہ کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تحریر کیا ہے:

''آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت ابراہیم کو کار رسالت کے ساتھ ایک دوسری ذمہ داری کے لیے قبول کیا۔ وہ ذمہ داری یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مختلف آزمایشوں سے گزارا اور جب وہ ان میں کامیاب ہو گئے تو انھیں انسانیت کی امامت کے لیے منتخب کر لیا۔ اس امامت کے نتیجے میں نبوت و رسالت کا سلسلہ آپ کی اولاد میں خاص کر دیا گیا اور آپ کی اولاد میں سے دو عظیم الشان امتیں اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان امتوں کی تاسیس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ شرک کی ان زنجیروں کو بالجبر توڑ ڈالیں جنھوں نے انسانیت کو صدیوں سے جکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ان کی شکل میں ایک ایسا معاشرہ ہر دور میں انسانوں کے سامنے رہے جو توحید کی بنیاد پر قائم ہو اور جہاں اللہ کے نبیوں کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق لوگ ایک خدا پرستانہ زندگی گزارتے ہوں۔ اس طرح یہ لوگ نہ صرف انسانوں پر حق کی شہادت دیں بلکہ شمع حق کی صورت،

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

> تاریکی میں بھٹکے ہوؤں کے لیے منزل کی طرف رہنمائی کرنے والے بھی بن جائیں۔اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے عروج کو اپنی فرماں برداری اور ان کے زوال کو اپنی نافرمانی سے مشروط کر دیا۔اس طرح حق لوگوں کے لیے تاریخ کی ایک سنی سنائی داستان نہ رہا، بلکہ حال کی ایک زندہ تصویر بن کر ان کے سامنے مجسم ہو گیا کہ کس طرح خدا اپنے فرماں برداروں پر رحمتیں اور غداروں پر عذاب نازل کرتا ہے۔''(۹۰)

اس کے بعد قرآنی آیات کے حوالے سے اس پس منظر کی تفصیل کی گئی ہے۔ پھر چوتھی بحث میں ''آل ابراہیم کا عروج و زوال ـــــــ تاریخ کی روشنی میں'' کے زیر عنوان بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی امامت کی تفصیل کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اقوام کو دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کیا اور ان کے عروج کو اپنی اطاعت سے مشروط رکھا۔ جب انھوں نے اللہ کی فرماں برداری کی تو سرفراز ہوئے اور جب نافرمانی کی تو اللہ کی سزا کے مستحق ٹھہرے۔ حصۂ دوم میں پانچویں بحث کے تحت آل ابراہیم کو لاحق ہونے والے امراض کی نشان دہی کی گئی ہے۔مصنف کے نزدیک یہ امراض شرک اور ظاہر پرستی ہیں جن کا شکار پہلے بنی اسرائیل اور پھر بنی اسماعیل ہوئے۔ان امراض کے باعث آل ابراہیم تقریباً تین ہزار سال کے بعد امامت سے معزول ہو گئے۔ یہ معزولی بغداد اور اسپین میں بنی اسمٰعیل کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ عمل میں آئی۔اس حصے کے اختتام پر مصنف نے یہ مقدمہ قائم کیا ہے کہ بنی اسماعیل کی معزولی کے باوجود امت مسلمہ ہی وہ امت ہے جو اللہ کی آخری شریعت کی حامل ہے۔اس بنا پر اس پر دنیا میں خدا پرستانہ معاشرے کے قیام کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔اس لیے دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہونے کا انحصار اس عہد و پیمان پر ہے جو یہ بحیثیت مجموعی یا اس کا کوئی حصہ خود آگے بڑھ کر خدا سے باندھ لے۔مصنف کے نزدیک اہل ترک اور اہل پاکستان نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد باندھا ہے۔اس بات کی تفصیل مصنف نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کل عالم کے لیے ہے اور آپ کی شریعت قیامت تک کے لیے آخری شریعت ہے، اس لیے بہر حال اس کے وارث بنی اسماعیل کے خاتمہ کے بعد بھی باقی رہے۔اسی طرح امت مسلمہ پر ایک خدا پرستانہ معاشرے کے قیام کی غیر مشروط ذمہ داری بھی اپنی جگہ باقی ہے۔ جہاں تک امت مسلمہ کی قیادت کا تعلق ہے تو آل ابراہیم کے بعد اس کا انحصار اس عہد و پیمان پر ہے جو کوئی قوم خود آگے بڑھ کر خدا سے باندھ لے۔ بنی اسماعیل کے بعد اب تک دو قوموں نے آگے بڑھ کر یہ عہد باندھا ہے۔ پہلی قوم ترک تھی۔ سلطان سلیم نے سن ۱۵۱۷ء میں مصر فتح کیا اور رسمی طور پر خلافت کا بار اپنے سر پر لے لیا۔عثمانیوں نے خود کو شریعت کا محافظ قرار دیا۔جس کے بعد وہ سیاسی اور روحانی طور پر امت مسلمہ کے امام قرار پائے۔ یہ ان کا عہد تھا جو انھوں نے خدا سے باندھا تھا۔جب تک انھوں نے اس کا حق ادا کیا عروج ان کا مقدر رہا اور جب کوتاہی کی تو زوال کی کھائی میں انھیں گرنا پڑا۔کئی صدیوں تک یہ بار اٹھانے کے بعد کمال اتاترک کی قیادت میں ترکوں نے خلافت کا خاتمہ کر کے اس عہد کو ختم کر دیا۔
>
> جس وقت ترکی میں اتاترک اسلام اور خلافت کو دیس نکالا دے رہے تھے، ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہندوستان میں

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

امت مسلمہ کا ایک غلام گروہ، خلافت کی بقا کے لیے اپنے انگریز آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ایسی جنگ کے لیے جس میں انھیں کچھ نہیں ملنا تھا، ان لوگوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔خلافت ختم ہوگئی۔ان لوگوں کے ہاتھ عالم اسباب میں کچھ نہ آیا۔مگر شاید ان کی بے پناہ قربانیوں کا اثر تھا کہ یہ قوم خدا کی نگاہ میں آ گئی۔

آنے والے سالوں میں حیرت انگیز طور پر حالات اس قوم کے سیاسی اقتدار کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے...جب اس قوم کی فکری و سیاسی قیادت، عوام الناس اور بڑی حد تک مذہبی قیادت نے یک سو ہو کر خدا سے یہ عہد کیا کہ اگر وہ انھیں زمین میں اقتدار دے گا تو وہ اسلام کا بہترین نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ یہ کم و بیش وہی صورت حال تھی جسے قرآن بنی اسماعیل کے حوالے سے یوں بیان کرتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (الحج ۲۲:۴۱)

''یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سر زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔''

اہل پاکستان کا معاملہ بھی یہی ہوگیا۔صرف اس فرق کے ساتھ کہ اس دفعہ یہ بات خدا کی طرف سے نہیں کہی گئی، بلکہ لوگ آگے بڑھے اور خدا سے یہ عہد کر لیا۔خدا نے ان کے قائدین کی درخواست قبول کر کے راہ کی ہر مشکل کو آسان کیا اور یوں دنیا کی سب سے بڑی مسلم حکومت اور پانچویں عظیم سلطنت کے طور پر پاکستان دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا۔اس طرح اہل پاکستان حضرت موسیٰ کی اس تنبیہ کا مصداق بن گئے جو انھوں نے اپنی غلام قوم یعنی بنی اسرائیل سے کہی تھی:

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ.

(الاعراف ۷:۱۲۹)

''امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو پامال کرے گا اور تم کو ملک کا وارث بنائے گا کہ دیکھے تم کیا روش اختیار کرتے ہو''۔ (۱۱۹)

حصۂ سوم اور چہارم میں پاکستانی قوم کے عروج و زوال کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔اس ضمن میں جملہ مباحث کی اساس مصنف کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ پاکستانی قوم ایک معاہد قوم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ باقاعدہ ایک عہد میں بندھی ہوئی ہے۔اس عہد کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''وہ عہد یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایک خود مختار خطۂ زمین دے تو ہم دنیا کے سامنے ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا نقشہ پیش کر کے دکھائیں گے۔ہم پچھلے باب میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو مسلمان پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا کے محبوب ہیں، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کے ذریعے ایک خدا پرستانہ معاشرہ لوگوں کے سامنے قائم رہے۔اہل پاکستان دوسرے مسلمانوں کی طرح اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے پابند ہیں، مگر انھوں نے ایک عام

اسلامی ذمہ داری کو عہد کی شکل دے کر اپنے معاملے کو خاص کر لیا ہے۔ کوئی فرد یا طبقہ ہمارے اس مقدمے کو اگر نہیں مانتا تب بھی وہ اپنے مسلمان ہونے کا منکر تو نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے اس اقرار کے بعد خدا پرستانہ معاشرہ قائم کرنا، بہرحال، مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ لگا کر جو ملک حاصل کیا گیا، اس کے باسیوں کے لیے توحید شریعت سے بے وفائی کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔''

(۱۲۳)

اس نقطۂ نظر میں مصنف چونکہ بالکل منفرد ہیں، اس وجہ سے اس امر کی ضرورت تھی کہ اس مقدمے کے لیے وہ اپنے دلائل کو بالتفصیل بیان کرتے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک تشنہ بحث ہے جسے پڑھ کر قارئین کے ذہنوں میں بعض سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا واقعۃً ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ'' کا نعرہ سیاسی نہیں، بلکہ خالص مذہبی تھا اور مسلمانان ہند نے اسے اللہ کے ساتھ معاہدے کے شعور کے ساتھ لگایا تھا؟ یہ اگر خالص مذہبی نعرہ تھا تو قوم کی مذہبی قیادت نے اسے کیوں اختیار نہیں کیا؟ یہاں کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ۱۸۵۷ء میں چھنے ہوئے اقتدار کی بحالی تو نہیں تھا؟ اور اگر ضمنی طور پر نفاذ اسلام کی تمنا موجود بھی تھی تو کیا اسی طرح کی ایک ضمنی تمنا معاشی ترقی بھی نہیں تھی؟ یہ اور اس نوعیت کے دیگر سوالوں کے جوابات ہی سے مصنف کا مذکورہ نقطۂ نظر موکد ہو کر سامنے آ سکتا ہے۔

مصنف نے عروج و زوال کے مختلف مراحل کو پاکستانی قوم پر منطبق کرتے ہوئے اس کے مختلف ادوار کا تعین کیا ہے۔ دور تشکیل ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کی آمد سے لے کر ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد تک ہے۔ مصنف کے نزدیک تقریباً ہزار سالہ دور میں برصغیر میں ایک جدید قوم کا ظہور ہوا جو اپنے مذہب، تہذیب، تمدن، روایات، نظام، اخلاق اور ثقافت کی بنیاد پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتی تھی۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تعمیر و شناخت کا پہلا دور ہے۔ اس میں شاہ ولی اللہ، سر سید احمد خان اور علامہ اقبال نے اس قوم کو راہ عمل دی اور اس کے قومی مزاج کو تشکیل دیا۔ تعمیر و شناخت کا دوسرا دور ۱۹۴۷ء سے زمانۂ حال تک ہے۔ اس زمانے میں انتہا پسندی اور مغربیت کی لہر کی وجہ سے قومی تنزل کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

آخری حصے کا عنوان ''پاکستان کا مستقبل —— خدشات و امکانات'' ہے۔ اس حصے میں قومی امراض کا جائزہ لیا گیا ہے اور قومی تعمیر کا لائحۂ عمل تجویز کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں چار امراض کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ امراض توحید سے اعراض، ظاہر پرستی، اخلاقی پستی اور علمی پس ماندگی ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے پاکستانی قوم سے اپنی توقعات کو نہایت دل سوزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''ان مایوس کن حالات میں امید کی کوئی کرن اگر موجود ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قوم کے ہر طبقہ میں ابھی تک زندہ لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہر میدان میں نئی قیادت وجود میں آ سکتی ہے۔ اس کتاب کے اصل مخاطب وہی لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نفسا نفسی اور خود غرضی کے اس دور میں قوم کے درد میں تڑپتے ہیں۔ جو اپنے نقطۂ نظر کے علاوہ دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جو جذباتیت اور انتہا پسندی کے بجائے اصول پسندی کو اپنا معیار بناتے ہیں۔ جو

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دنیاپرست الحادی تہذیب کے مقابلے میں نبیوں کی تہذیب کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا ان کی نگاہ میں ایسا بڑا ہے کہ وہ کسی اور کی بڑائی کو دل میں جگہ نہیں دے سکتے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح آخری نبی مان چکے ہیں کہ آپ کے بعد کسی اور کی بات کو وہ حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔ جو صحابۂ کرام کی طرح حق پر کسی اور چیز کو ترجیح نہیں دے سکتے اور اس کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس قوم کی تباہ حال تقدیر بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی لوگ اس دھرتی پر ہماری واحد امید ہیں۔'' (۱۵۳)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خیال و خامہ

جاوید

○

ترا وجود نظر کی تلاش میں ہے ابھی
یہ خاک اپنے شرر کی تلاش میں ہے ابھی

پہنچ ہی جائے گا منزل پہ کارواں اپنا
اگرچہ رختِ سفر کی تلاش میں ہے ابھی

افق سے ڈھونڈ کے لائی تھی آرزو جس کو
وہ آفتاب سحر کی تلاش میں ہے ابھی

تری نوا میں کمالِ ہنر تو ہے، پھر بھی
ذرا سے خونِ جگر کی تلاش میں ہے ابھی

سمجھ ہی لے گا حقیقت سے آشنا ہو کر
زمانہ فوقِ بشر کی تلاش میں ہے ابھی

حضورِ عشق میں آئی تو ہے خرد، لیکن
وہاں بھی نفع و ضرر کی تلاش میں ہے ابھی

مرا غزال سوادِ ختن میں آ پہنچا
سنا ہے اپنے ہی گھر کی تلاش میں ہے ابھی

www.javedahmadghamidi.org
www.javedahmadghamidi.com